ہفت روزہ
ندائے خلافت
لاہور
۱۹ ستمبر ۱۹۹۵ء

☆ اسلام کے احیاء کا نقطۂ آغاز پاکستان ہو گا : امیرِ تنظیم اسلامی

☆ کیا کراچی میں مشرقی پاکستان کی تاریخ دہرائی جائے گی؟ تجزیہ

☆ ہمارے مسائل کا حل---- چھوٹے صوبے اور داخلی خودمختاری

حدیثِ امروز

جنرل (ر) محمد حسین انصاری

صوبہ پنجاب کے طوفان

گزشتہ تین ماہ سے صوبہ پنجاب دو مختلف طوفانوں کی لپیٹ میں ہے' موسمی اور سیاسی۔ یہ طوفان نوعیت میں مختلف لیکن نتیجے کے اعتبار سے بالکل ایک جیسے ہیں' یعنی نااہلی بڑوں کی مگر شامت عوام کی۔ بارشیں ہر سال ہوتی ہیں اور اتنی ہی ہوتی ہیں لیکن عیار نوکر شاہی' نااہل انتظامیہ اور نکمے اہلکار معلوم آبی گزرگاہوں کو بروقت صاف کرنے اور زائد پانی کی روک تھام کے لئے مضبوط بند تیار رکھنے کی بجائے سال بھر غفلت کی نیند سوتے ہیں اور سیلاب کے دنوں میں غریبوں کو طوفان کی تباہ کاریوں کا شکار ہوتے دیکھ کر اس بیان کی آڑ میں فرار کی راہ اختیار کر لیتے ہیں کہ بارشیں معمول سے زیادہ ہوئیں۔ یہ بڑے لوگ کیا جانیں کہ ایک طوفان کی تباہ کاری غریب کی حقیری کائنات کو کس قدر زک پہنچا دیتی ہے کہ وہ ابھی سنبھل نہیں پاتا کہ آئندہ سال پھر طوفان اسے اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

یہی حال سیاسی طوفان کا ہے۔ عوام امیدوں کے سنہرے خواب اپنے خیالوں میں سجائے' امنگوں کے چراغ جلائے' اچھے مستقبل کی آس لگائے' اور اعتماد کی دنیا بسائے اپنے سیاسی نمائندوں کو کاندھوں پہ اٹھائے ایوان اقتدار تک پہنچانے میں فخر محسوس کرتے ہیں کہ ارباب اقتدار سوچ بچار سے کام لیتے ہوئے غریب کی زندگی خوشگوار بنانے میں مصروف عمل رہیں گے۔ ان حضرات ذی وقار نے غریب کی زندگی کس قدر خوشگوار بنائی ہے کسی تفصیل کی محتاج نہیں۔ البتہ اس ضمن میں جتنا کم کہا جائے بہتر ہو گا۔ مہنگائی' بدانتظامی' اقرباپروری' کرپشن اور پیسے کی دوڑ میں غریب کس طرح زندگی کا بھاڑ جھونک رہا ہے بذات خود ایک بہت بڑا معمہ ہے۔ پھر یہی نہیں' سیاستدان عوام الناس کے لئے کوئی امید کی کرن بھی تو آشکار نہیں کرتے بلکہ بے اصولی اور ذاتی مفاد کے تحفظ کی علت نے ایسی بے یقینی کی فضا قائم کر دی ہے کہ عوام مستقل نفسیاتی دباؤ کے تحت مایوسی کا شکار ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ پنجاب کی سیاسی صورتحال پر نظر ڈالئے۔ ۱۹۹۳ء میں میاں نواز شریف کی حکومت کے خاتمہ میں جونیجو لیگ نے بہت اہم کردار ادا کیا تھا اور اسی وجہ سے پی۔ ڈی۔ ایف قائم ہوا جس کے نتیجے میں پنجاب میں مخلوط حکومت کے ذریعے میاں منظور احمد وٹو کو جن کے ساتھ صرف سولہ ایم پی اے تھے' وزارت علیا نصیب ہوئی اور میاں نواز شریف کی جانب سے میاں منظور احمد وٹو کو لوٹے کا خطاب عطا ہوا۔ مخلوط حکومت کے ۲۳ ماہ کے دور اقتدار میں شاید ہی کوئی دن شکوے' گلے اور بد اعتمادی کے بغیر آیا ہو۔ شنید ہے کہ انتخابات سے قبل۔ پی۔ ڈی۔ ایف کا ایک تحریری معاہدہ ہوا تھا مگر یہ معاہدہ کبھی منظر عام پر نہ آیا اگرچہ شکایت کی بنیاد ہی اس معاہدے کی خلاف ورزی کا الزام تھا۔ وزیر اعلیٰ پیپلز پارٹی کی اس مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اپنی ڈگر پر قائم رہے کہ پیپلز پارٹی از خود اپنی حکومت بنا لینے کی پوزیشن میں نہیں اور پیپلز پارٹی کے وزراء اپنی مجبوری سے جھلا کر وزیر اعلیٰ کو ہٹا دینے کی دھمکیوں میں مصروف رہے۔ نتیجتاً انتظامی مشینری مفلوج ہو کر رہ گئی اور عوام کے مسائل مزید الجھ گئے۔ بالآخر صدر مملکت نے گورنر کی درخواست پر پنجاب اسمبلی کو معطل کر دیا اور یوں سیاسی جوڑ توڑ کے نئے دور کا آغاز ہوا کہ اسمبلی کسے نیا وزیر اعلیٰ منتخب کرتی ہے۔ نتیجہ کچھ بھی نکلے یہ گاڑی ہموار چلتی دکھائی نہیں دیتی۔ تو نقصان کس کا ہو گا؟ نقصان ہو گا بھلائی کا' عوام کا' ملک کا۔ ان حالات میں اہم ترین مسئلہ یہ نہیں کہ ملک میں نظام کیسا ہو بلکہ یہ کہ انتظام پر عمل درآمد کرانے والے کیسے ہوں۔ جب تک عوام موروثی سیاست دانوں سے اس ملک کی جان نہیں چھڑا لیتے کہ جو اپنے اقتدار کی ہوس میں ہر بے اصولی کو ڈھٹائی کے ساتھ گلے لگا لینے میں ذرہ بھر عار محسوس نہیں کرتے' اور جب تک عوام آمروں کو ملک پر قابض ہونے سے روک دینے کی ٹھان نہیں لیتے اس وقت تک پاکستان کے قیام کے مقاصد پورے نہ ہو پائیں گے۔ اپنوں میں سے اچھے لوگوں کو ایوان اقتدار تک پہنچایئے۔ شعور اور امارت لازم و ملزوم نہیں۔ غریب اور سفید پوش تو زیادہ باشعور ہوتا ہے۔ یہ امر یقینی ہے کہ حرص امیر کا شیوہ ہے' عام آدمی کا نہیں۔ شاید کہ ایسے لوگوں پر مشتمل پارلیمنٹ صحیح نظام قائم کرنے اور اس پر مخلصانہ عملدرآمد کرنے میں کامیاب ہو جائے۔

قیمت : ٦ روپے

الھدیٰ

ترجمانی : حافظ عاکف سعید

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بلاشبہ آسمانوں اور زمین کی بناوٹ میں اور رات دن کے بدلتے آنے میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں ○

(کہ کائنات کا مربوط نظام' زمین و آسمان جس کا ایک نہایت معمولی حصہ ہیں' اور اس کے عجائبات اور رات دن کا الٹ پھیر... ایسا کہ اس میں کبھی کوئی خلل نہیں پڑتا اور زندگی کے تمام معمولات جس کے گرد گھومتے ہیں... قلب صمیم اور عقل سلیم رکھنے والوں کو لازماً اس نتیجے پر پہنچاتے ہیں کہ یہ مربوط نظام کسی ایسی اعلیٰ وارفع ذات کے قبضہ قدرت میں ہے جو خود اس کائنات کی خالق اور موجد بھی ہے!)

وہ لوگ جو یاد کرتے ہیں اللہ کو کھڑے اور بیٹھے ہوئے اور کروٹ کے بل لیٹے ہوئے۔

(اپنے خالق و مالک کو پہچان لینے اور حقیقت الحقائق کا ادارک کرنے کے بعد وہ ہوشمند لوگ کسی بھی حال میں' چاہے معمولات زندگی میں سے گزرتے ہوئے کھڑے یا بیٹھے ہوئے ہوں خواہ آرام کے لئے بستر پر دراز ہوں' اس قادر مطلق اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہوتے)

اور جو غور و فکر کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی بناوٹ میں'

(وہ لوگ ہر حال میں اللہ کو یاد رکھتے ہوئے بھی مظاہر فطرت اور ان میں اپنے رب کی قدرت کا مشاہدہ کرتے اور مسلسل غور و فکر کرتے رہتے ہیں تاکہ ان کی حکمت ان پر زیادہ سے زیادہ کھلتی چلی جائے)

اے ہمارے رب! تو نے یہ سب کچھ عبث نہیں بنایا' تو پاک ہے' پس بچا لے ہمیں آگ کے عذاب سے ○

(اور آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہمارے رب نے یہ ساری بساط بے مقصد نہیں بچھائی۔ یہ کائنات رام کی لیلا نہیں ہے۔ اس سارے انتظام میں بڑی حکمت پوشیدہ ہے۔ اس کی ذات بے مقصد کام کرنے کے عیب سے پاک ہے۔ اس نے خود ہمیں بھی ایسے ہی نہیں پیدا کر دیا۔ اس نے انسان میں نیکی اور بدی کا جو شعور ودیعت کیا ہے وہ بھی بلاوجہ نہیں ہے۔ سمجھ میں آتا ہے کہ اس مہلت عمر کے بعد بھی ہمیں اس کے سامنے پیش ہونا اور اپنے اعمال کا حساب دینا ہے' تو اے ہمارے رب! اس موقع پر ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لیجئو)

اے ہمارے رب! جسے تو نے نار جہنم میں ڈال دیا' سو اسے تو رسوا کیا اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ○

(تیرے جو بدبخت بندے تجھے پہچاننے کی کوشش نہیں کرتے اور سرتاپا دنیاداری اور نفس پرستی میں مشغول ہیں' ظاہر ہے کہ ان کا انجام یہ ہو گا کہ آگ کے عذاب میں مبتلا کر دیئے جائیں گے اور یہ وہ ذلت و رسوائی ہو گی جس کا آج دنیا کے عیش میں مگن رہتے ہوئے' وہ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اپنے خالق اور رب کو پہچاننے سے انکار کر دینے والے سے بڑا ظالم کون شخص ہو گا اور ایسے ظالموں کی حساب کتاب کے دن مدد کرنے والا کون ہو گا!)

(سورۂ آل عمران آیات ۱۹۰ تا ۱۹۲)

تاخلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

○

تحریکِ خلافت پاکستان کا نقیب

ہفت روزہ
ندائے خلافت
لاہور

بانی مدیر : اقتدار احمد مرحوم

جلد ۴ شمارہ ۳۸
۱۹ ستمبر ۱۹۹۵ء

12

مدیر : حافظ عاکف سعید

معاون مدیر : نثار احمد ملک

○

یکے از مطبوعات

تحریکِ خلافت پاکستان

۴۔ اے، مزنگ روڈ، لاہور

○

مقام اشاعت

۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

فون : ۵۸۶۹۵۰۱

○

پبلشر : محمد سعید اسعد طابع : رشید احمد چودھری

مطبع : مکتبہ جدید پریس، ریلوے روڈ، لاہور

○

قیمت فی پرچہ : -/۶ روپے
سالانہ زرتعاون (اندرون پاکستان) -/۱۲۵ روپے

○

زرتعاون برائے بیرون پاکستان

سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، بھارت ——— ۱۳ امریکی ڈالر
مسقط، عمان، بنگلہ دیش ——— ۱۰ " "
افریقہ، ایشیا، یورپ ——— ۱۶ " "
شمالی امریکہ، آسٹریلیا ——— ۲۰ " "

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایڈیٹر کے ڈیسک سے

زیرِ نظر شمارہ تیاری کے آخری مراحل میں تھا جب صدر پاکستان نے اپنے خصوصی اختیارات کو بروئے کار لاتے ہوئے پنجاب کے وزیر اعلیٰ کو معطل کر کے یہاں گورنر راج کے نفاذ کا اعلان کیا۔ اس کے بعد چند دنوں کے اندر اندر سیاسی جوڑ توڑ اور ہارس ٹریڈنگ کا وہ بازار گرم ہوا' اور بے اصولے پن اور سیاسی قلابازیوں کے وہ مظاہر سامنے آئے کہ الامان والحفیظ۔ پنجاب میں شائع ہونے والے اخبارات کا صفحہ اول قریباً پورا پنجاب اسمبلی' اس کے ارکان' اور آئندہ پنجاب حکومت کے بارے میں قیاس آرائیوں' گوناگوں دعووں اور بیانات کے لئے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے اور دیگر تمام اہم قومی مسائل پس پردہ چلے گئے ہیں۔ یہ سب اس پارلیمانی سیاست کی نحوست ہے جس کا طوق انگریز ہماری گردنوں میں ڈال کر رخصت ہوا تھا اور جسے آج ہم بڑے فخر سے سینے سے لگائے پھرتے ہیں۔ قومی مسائل اور عوام کی مشکلات کو حل کرنے کی کسے فرصت ہے۔ ہمارے سیاسی رہنما اور ارکان اسمبلی اپنے ذاتی مفادات کے گرداب سے باہر نکلیں تو ملک و قوم اور عوام کی بہبود کی طرف متوجہ ہوں!!--- اس صورتحال کے حوالے سے "حدیث امروز" میں محترم جنرل (ر) محمد حسین انصاری صاحب نے جن امور کی طرف توجہ دلائی ہے وہ بلاشبہ نہایت قابل لحاظ ہیں۔

کراچی کے موجودہ سنگین حالات کے بارے میں متعدد اطراف سے یہ رائے سننے میں آتی ہے کہ وہاں بالکل مشرقی پاکستان کے سے حالات پیدا ہو چکے ہیں اور اس کی علیحدگی کا سامان کیا جا چکا ہے۔ اس ضمن میں زیرِ نظر شمارے میں شامل ایس ایم اختر صاحب کا مضمون ہمارے نزدیک خصوصی اہمیت کا حامل ہے کہ صاحب مضمون مشرقی پاکستان کے حالات کے بھی چشم دید گواہ ہیں کہ سقوط مشرقی پاکستان سے قبل ان کا قیام وہیں تھا اور اب چونکہ گزشتہ بیس بائیس سال سے وہ کراچی میں مقیم ہیں لہٰذا کراچی کی پیچ در پیچ صورتحال اور اس کے اسباب و عوامل پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان کا پیش کردہ تجزیہ حقیقت پسندانہ بھی ہے اور متوازن بھی! ہمیں یقین ہے کہ قارئین دلچسپی اور توجہ سے اس مضمون کا مطالعہ کریں گے۔

گزشتہ شمارے میں ہم نے "ندائے خلافت" کے بانی مدیر اقتدار احمد مرحوم کے بارے میں نوجوان صحافی تنویر قیصر شاہد کا مفصل تاثراتی مضمون شائع کیا تھا۔ ہم یہ خیال کر رہے تھے کہ یہ اس سلسلے کا آخری مضمون ہو گا' لیکن پچھلے پندھواڑے کے دوران ہمیں ایک ایسا مضمون موصول ہوا ہے جسے نظرانداز کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں ہے۔ یہ مضمون ہے پروفیسر سید مشکور حسین یاد صاحب کا جن کی شخصیت ہرگز محتاج تعارف نہیں ہے۔ وہ بیک وقت شاعر بھی ہیں اور انشائیہ نگار بھی' نقاد بھی ہیں اور مزاح نگار بھی۔ "ندا" اور مدیر ندا کے ساتھ ان کا جو قریبی تعلق رہا اس کی تفصیل ان کے مضمون میں بصراحت مذکور ہے۔ ہمارے رفقاء و احباب میں سے اکثر کے علم میں ہو گا کہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیرِ اہتمام سالانہ قرآن کانفرنسوں کا انعقاد جب تک ٹاؤن ہال میں ہوتا رہا' محترم مشکور صاحب اس کے مستقل مقررین میں شامل رہے۔ ان کانفرنسوں میں ہر مسلک اور مکتب فکر کے اہل علم حضرات کو قرآن کے موضوع پر دعوت خطاب دی جاتی تھی اور مشکور حسین یاد صاحب گویا اہل تشیع کی نمائندگی کرتے تھے۔ تاہم محترم ڈاکٹر اسرار احمد اور ان کے خاندان سے محترم شکور صاحب کا تعلق کوئی دس پندرہ برس کی بات نہیں' نصف صدی کا قصہ ہے اور اس داستان کا آغاز قیام پاکستان سے قبل مشرقی پاکستان کے ایک قصبے حصار سے ہوتا ہے۔ محترم مشکور صاحب نے اپنے مضمون میں بعض باتیں اپنے مسلک کے حوالے سے بھی چھیڑی ہیں' تاہم ان پر کوئی تبصرہ کئے بغیر ہم ان کے مضمون کو من و عن ہدیہ قارئین کر رہے ہیں۔

اعتذار

کراچی میں مقیم ہمارے ایک قابل احترام' بزرگ رفیق قاضی عبدالقادر صاحب نے جناب اقتدار احمد مرحوم کی وفات پر امیر تنظیم اسلامی کے نام تعزیتی پیغام بذریعہ فیکس ارسال کیا تھا۔ ان دنوں چونکہ ڈاک اور فیکس کے ذریعے روزانہ بیسیوں تعزیتی پیغامات ہمیں موصول ہو رہے تھے لہٰذا اس کا احتمال موجود ہے کہ ان میں سے کوئی ایک آدھ چٹھی ہم سے ضائع ہو گئی ہو۔ محترم قاضی صاحب کا تعزیتی پیغام چونکہ ہمارے ریکارڈ میں محفوظ نہ رہ سکا لہٰذا نہ صرف یہ کہ وہ "ندائے خلافت" میں تعزیتی خطوط کے کالم میں اشاعت پذیر نہ ہو سکا بلکہ اس فہرست میں بھی ان کا نام شائع ہونے سے رہ گیا ہے جو ان جملہ احباب و رفقاء کے ناموں پر مشتمل تھی جنہوں نے اس موقع پر تعزیتی پیغامات ارسال کئے تھے۔ یہ صورتحال محترم قاضی صاحب کے لئے ذہنی اذیت اور کوفت کا باعث بنی جس کے لئے ادارہ معذرت خواہ ہے۔OO

کیا کراچی میں مشرقی پاکستان کی تاریخ دہرائی جائے گی؟

ذوالفقار علی بھٹو کی بیٹی اپنے باپ کے نقش قدم پر چل رہی ہے!

الطاف حسین خود کو شیخ مجیب الرحمٰن ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں!!

مشرقی پاکستان اور کراچی کی صورتحال کا ایک بھرپور موازنہ

ایس ایم اختر

پاکستان جو مسلم قومیت کی بنیاد پر معرض وجود میں آیا اپنی عمر کی ربع صدی کی تکمیل سے قبل ہی قوم پرستی کی تیز و تند آندھی کی لپیٹ میں آگیا۔ خلیج بنگال میں اکثر و بیشتر ہوا کا دباؤ بڑھ جانے کی وجہ سے مشرقی پاکستان طوفانوں کی زد میں رہا کرتا تھا۔ 1960ء کی دہائی میں اٹھنے والے طوفان نے جو تین دن اور دو راتیں جاری رہا تھا بڑی تباہی مچائی تھی۔ پھر ایسی ہی ایک تباہی 70 کی دہائی میں آئی جس کی زد میں ڈیمرا' نارائن گنج کا علاقہ آیا اور پھر اسی عشرے میں وہ خوفناک طوفان اٹھا جس نے باریسال اور کھلنا کے ساحلی علاقوں میں تباہی اور ہلاکت خیزی برپا کی۔ لیکن یہ وہ طوفان تھے جو سب کو نظر آتے تھے جبکہ کچھ خاموش طوفان بھی ہوا کرتے ہیں جن کے جھکڑوں کو انسان محسوس نہیں کرتا لیکن وہ اچانک لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ ایسا ہی ایک طوفان وہ تھا جو 1952ء میں شروع ہوا تھا۔ بنگلہ بھاشا کی تحریک جو بالآخر ایوب خان مرحوم کی حکومت کے زوال کے ساتھ بنگلہ قومیت کی تحریک میں بدل گئی۔ 1970ء کے آغاز سے شروع ہونے والے اس طوفان نے پورے مشرقی پاکستان کو اپنی لپیٹ میں لے کر اس قدر ہلاکت خیزی اور تباہی مچائی کہ اس خطہ زمین کی ہیئت میں تبدیل ہو گئی اور یہ مشرقی پاکستان سے بنگلہ دیش بن گیا جس کے نتیجہ میں لاکھوں افراد قتل ہوئے' ہزاروں عصمتیں لٹیں اور ارب ہا ارب روپے کے املاک کی تباہی ہوئی اور لوگوں کو 1947ء کے بعد ایک بار پھر ہجرت کا سامنا کرنا پڑا۔

پہلی ہجرت کے موقع پر بھی یہی کچھ ہوا تھا لیکن اس وقت مرنے والے شہید گردانے گئے تھے اور جو زندہ بچ گئے وہ غازی' کیوں کہ مقابلہ کہیں ہندوؤں سے تھا تو کہیں سکھوں سے!! لیکن اس مرتبہ انہیں ہندوؤں کی وزیراعظم نے طعنہ زنی کی تھی کہ جنت میں دو فرشتے لڑ رہے ہیں۔ بہرحال یہ ہماری ہی کوتاہیوں کا نتیجہ تھا۔ ہم نے یہ ملک حاصل کیا تھا اسلام کے نام پر لیکن حصول آزادی کے بعد اسلام کا نام صرف اپنے اقتدار کے استحکام اور اس کے دوام کے لئے استعمال کرتے رہے۔ جب قائدین اور عمائدین سلطنت کی

> "وزیرۂ عظمیٰ بے نظیر بھٹو فرماتی ہیں کہ دہشت گردی اور سیاست دو الگ الگ چیزیں ہیں' کاش کہ وہ اپنے عمل سے اسے ثابت کرتیں"

اپنی زندگیوں میں اسلام کا عمل دخل نہ رہا تو ملک کیسے اسلامی بنتا۔ ہاں البتہ برائے نام اسلامی جمہوریہ پاکستان ضرور بن گیا۔ چاہئے تو یہ تھا کہ ہم سقوط ڈھاکہ سے سبق سیکھ کر اسلام کی طرف پیش رفت کرتے جو ملک کی بقاء اور اس کے استحکام دونوں کے لئے ضروری ہے۔ لیکن افسوس کہ ہمارے شب و روز میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔

آج بحیرہ عرب کے کنارے قوم پرستی کا ایک اور طوفان اٹھا ہوا ہے جس کی لپیٹ میں کہتے ہیں کہ کراچی سے مکران تک کے ساحلی علاقے آئے ہوئے ہیں۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ طوفان کتنی تباہی اور ہلاکت کا پیش خیمہ بنتا ہے۔ ہمارے ملک کے کچھ زعماء اس صورت حال کو مشرقی پاکستان کی صورتحال سے مشابہ قرار دیتے ہیں جبکہ کچھ ان کے خیال سے اتفاق نہیں رکھتے۔ آیئے ہم مشرقی پاکستان اور کراچی کی صورت حال کا جائزہ لیتے ہیں تاکہ یہ دیکھیں کہ کہاں کہاں دنوں میں مشابہت ہے اور کہاں کہاں نہیں۔

دونوں جگہوں کی ابتر صورتحال کی بنیادی وجہ

پاکستان جمہوری عمل کے نتیجے میں وجود میں آیا تھا۔ مشرقی پاکستان کی آبادی 56 فیصد تھی۔ اس کا منطقی تقاضہ تو یہ تھا کہ اقتدار کی باگیں بنگالیوں کے ہاتھوں میں ہوتیں لیکن پاکستان کے ابتدائی 10 برسوں میں محلاتی سازشوں کے ذریعے انہیں اس حق سے محروم رکھا گیا۔ بعد ازاں ملک پر مارشل لاء کا تسلط قائم ہوگیا۔ فوج کی حکمرانی کا مطلب ان لوگوں کی حکمرانی تھی جو اقلیت میں تھے اور یہ جمہوری اصولوں کی سراسر خلاف ورزی تھی۔ لہٰذا بنگالیوں کے اندر احساس محرومی نے جنم لیا' جس کی جڑیں وقت کے ساتھ ساتھ مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئیں۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ انکی زبان ملک کی 56 فیصد آبادی کی زبان ہے لیکن اس کے باوجود اردو زبان کو جو صرف ہندوستان کے اقلیتی صوبوں سے ہجرت کر کے آنے والوں کی زبان ہے' قومی زبان کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ مہاجروں کو اس سے دو فائدے حاصل ہوتے تھے۔ پہلی بات تو یہ کہ ان میں سے بیشتر افراد ہندوستان کی سول سروس کے ملازمین تھے جو پاکستان OPT کر کے آئے تھے لہٰذا پاکستان کی سول سروس میں بھی انہی کا غلبہ رہا۔ مزید برآں اردو کے قومی زبان ہونے کا سب سے زیادہ فائدہ بھی انہیں کو ہی پہنچا۔ بنگالیوں کی اکثریت نے اردو زبان سیکھنے کی کوئی کوشش ہی نہ کی جبکہ پاکستان کی دوسری قومیتوں نے اس زبان کو یا تو پہلے سے اپنایا ہوا تھا یا ضرورت کے تحت ایسا کرنے پر

مجبور ہوئے۔ نتیجتاً نہ صرف ملازمتوں بلکہ کاروباری حلقوں میں بھی مشرقی پاکستان میں مقیم مہاجروں کا رجحان زیادہ تر مغربی پاکستان والوں تک رہا۔ اس کے علاوہ بنگال کے اس حصے کے لوگوں پر جو پاکستان میں شامل ہوا' ہندوؤں کا غلبہ تھا' جس کی بنا پر ایک مغلوب قوم میں جو کمزوریاں ہونی چاہئے تھیں' وہ ان میں موجود تھیں۔ اس کے برعکس ہندوستان سے ہجرت کر کے جو لوگ پاکستان آئے تھے وہ بیشتر ان علاقوں سے تعلق رکھتے تھے جہاں ان کا مقامی ہندوؤں پر غلبہ تھا۔ لہٰذا فطری طور پر مہاجروں کے اندر بنگالیوں کے مقابلے میں برتری کا احساس موجود تھا۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے بنگالیوں اور مقامی مہاجروں کے درمیاں فاصلے بڑھتے چلے گئے تاآنکہ جس زمانے میں بنگالیوں نے علم بغاوت بلند کیا' انہوں نے مہاجروں کو پاک فوج کا ساتھ دینے کی بنا پر Collaborators قرار دیا۔ مہاجروں کو اس معاملے میں مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا کیوں کہ وہ پاکستان کے خالقوں میں سے تھے' وہ کیسے گوارا کر سکتے تھے کہ جس پاکستان کی خاطر انہوں نے جانیں دیں' عزتیں لٹوائیں' گھربار چھوڑے' اس کا ایک بازو بنگلہ دیش بن جائے۔ مختصر یہ کہ ان حالات کی بنا پر بنگالی اکثریت میں ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو محکوم تصور کرنے لگے لہٰذا احساس محرومی کی اس شدت نے انہیں پاکستان کے خلاف سر اٹھانے پر مجبور کیا۔

اب آئیں اس حوالے سے کراچی کی صورتحال کا جائزہ لیتے ہیں۔ کراچی جو ہر لحاظ سے ایک مہاجر شہر ہے' جہاں نہ اس کی اپنی کوئی مقامی آبادی ہے' نہ پینے کا پانی اپنا ہے حتیٰ کہ سبزی ترکاری بھی اپنی نہیں! ملیر کے باغات کی سبزیوں کی پیداوار کو چھوڑ کر باقی ساری سبزیاں باہر سے آتی ہیں۔ پانی یا تو ڈملوٹی کے کنوؤں سے' ہالیجی' دھابیجی' کینجھر کی جھیلوں سے یا پھر جب ندی سے آتا ہے۔ اندرون ملک سے پھل اور سبزیاں آتی ہیں' حتیٰ کہ موسم بھی کوئٹہ سے آتا ہے۔ اس شہر کو آباد کرنے میں سب زیادہ حصہ مہاجروں کا ہی رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ صوبہ سرحد کے جفاکش لوگوں نے اس شہر کی تعمیر و ترقی میں ہاتھ بٹایا ہے' بلوچستان کے کاروباری طبقے کی محنت بھی اس میں شامل ہے' پنجاب کے کاروباری حضرات اور سول ملازمین بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ البتہ سندھ کے وڈیروں کے علاوہ صرف وہ سندھی یہاں آباد ہیں جو سرکاری محکموں میں ملازم ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ سندھ کے اس سب سے بڑے شہر کی تعمیر و ترقی میں سب سے کم حصہ سندھیوں کا ہی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب سول سروس میں مہاجر چھائے ہوئے تھے۔ ایوب خان مرحوم کے دور میں SON OF THE SOIL کا کالا قانون بھی نافذ ہوا اور مہاجروں کی ملازمتوں سے چھانٹیاں بھی شروع ہوئیں۔ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے دور میں کوٹہ سسٹم نافذ ہوا جس نے مہاجروں کی کمر توڑ دی۔ وہ تو خیر ہوا کہ خلیج کی ریاستوں اور دوسرے بیرونی ممالک میں مہاجر تعلیم یافتہ اور ہنر مند افراد نے ملازمتیں حاصل کر لیں۔ لیکن جب یہ سلسلہ بھی ختم ہوا تو جو لوگ باہر سے واپس آئے ان کے لئے یہاں ملازمتوں کے مواقع بھی نہیں رہے اور ان میں سے بیشتر افراد کاروبار کا تجربہ بھی نہ رکھتے تھے۔ اعلیٰ تعلیم کے دروازے بھی P.R.C کے قانون کی موجودگی میں ان پر تقریباً بند ہو گئے۔ غرض کہ ہر طرح کی ناانصافی کا انہیں سامنا کرنا پڑا۔ ظلم و ناانصافی کا شکار تو سندھی بھی اپنے جاگیرداروں اور وڈیروں کے ہاتھوں ہوئے۔ لیکن ایک تو وہ اپنے گوٹھوں کو چھوڑ کر باہر نہیں نکلے' دوسرے وہ حالات پر قانع ہو کر بیٹھ رہے۔ وڈیروں نے ایسے حالات پیدا کر رکھے ہیں جن کی موجودگی میں ان کے لئے تعلیم کا حصول بھی دشوار ہے۔ اس کے برعکس مہاجر جو شروع سے ہی برتر پوزیشن میں تھے اور تعلیم نے انہیں شعور بھی عطا کیا تھا لہٰذا ان کے نوجوانوں نے اپنے احساس محرومی کو دور کرنے کے لئے جدوجہد کا آغاز کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے نہ صرف یہ کہ کراچی اور حیدر آباد کی سیاست پر چھا گئے بلکہ قومی سیاست میں بھی اہم کردار ادا کرنے کی پوزیشن میں آ گئے۔ اس گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ مشرقی پاکستان اور کراچی دونوں کی صورت حال کی بنیادی وجہ ظلم و ناانصافی کے نتیجے میں احساس محرومی کا پیدا ہونا ہے۔

دونوں تحریکوں کے آغاز کا بنیادی سبب

1970ء کے عام انتخابات کے نتیجے میں عوامی لیگ نے مشرقی پاکستان کی ایک سیٹ کے سوا قومی اسمبلی کی تمام سیٹوں پر کامیابی حاصل کر کے پورے ملک میں اکثریت حاصل کر لی۔ اس واحد سیٹ پر میمن سنگھ کے حلقہ انتخاب سے نور الامین مرحوم نے کامیابی حاصل کی تھی۔ جبکہ مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی نے اکثریت حاصل کی۔ جمہوری اصولوں کے مطابق اقتدار عوامی لیگ کے حوالے کر دیا جانا چاہئے تھا لیکن ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی شاطرانہ حکمت عملی کی بنا پر ایسا نہ ہو سکا۔ بنیاد اس بات کو بنایا گیا کہ عوامی لیگ کے چھ نکات ملکی سالمیت کے خلاف ہیں لہٰذا اگر اقتدار اسے دے دیا گیا تو ملک کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ اس وقت کی مارشل لاء حکومت کے اقتدار کو عوامی لیگ کے حوالے کرنے میں پس و پیش کے نتیجے میں بنگالیوں کے احساس محرومی نے شدت اختیار کر لی جس کے نتیجے میں عوامی تحریک برپا ہوئی۔

اس کے برعکس ایم کیو ایم نے جب صوبائی اسمبلی کی کراچی اور حیدر آباد کی سیٹوں پر بھرپور کامیابی حاصل کی تو اسے ایک معاہدہ کے تحت پیپلز پارٹی کے دوسرے اور بے نظیر بھٹو کے پہلے دور حکومت میں اقتدار میں شرکت کا موقع تو ملا لیکن مہاجروں کے مسائل کے حل نہ ہونے کی بنا پر ایم کیو ایم نے پیپلز پارٹی سے معاہدہ توڑ کر آئی جے آئی کے ساتھ اتحاد قائم کر لیا۔ آئی جے آئی کے دور حکومت میں بھی ایم کیو ایم کو اقتدار میں شرکت کا موقع ملا لیکن مہاجروں کے مسائل نہ حل ہونے تھے نہ ہی ہوئے۔ اس کے برعکس 1992ء میں سندھ کے شہری اور دیہی علاقوں میں سماج دشمن عناصر کے خلاف ملٹری آپریشن شروع ہوا جو بعد میں ایم کیو ایم کے خلاف بھرپور آپریشن کا ذریعہ بنا۔ موجودہ حالات کی خرابی کی بنیادی وجہ اسی آپریشن کا شروع ہونا تھا۔

شیخ مجیب الرحمان اور الطاف حسین کا موازنہ

عوامی لیگ کے اس وقت کے سربراہ شیخ مجیب الرحمان اور ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین میں بنیادی مماثلت یہ ہے کہ ان دونوں نے اپنی سیاست کا آغاز طالب علم لیڈر کی حیثیت سے کیا اور دونوں کو عروج ان کی پنجاب پر تنقید کی پالیسی کی بنیاد پر حاصل ہوا۔ لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ شیخ مجیب الرحمان نے عوامی لیگ خود قائم نہیں کی تھی بلکہ اس کی قیادت حسین شہید سہروردی مرحوم جیسے منجھے ہوئے سیاست دان کے ہاتھوں میں تھی اور شیخ مجیب الرحمان نے سیاست کا سبق انہی سے سیکھا تھا۔ دوسری طرف ایم کیو ایم کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کی بنیاد جنرل ضیاء الحق مرحوم کے دور میں ان کی سیاسی ضرورت پوری کرنے کے لئے ڈالی گئی۔ الطاف حسین ایم کیو ایم کے بانی ہیں اور اس سے قبل وہ آل پاکستان مہاجر اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے لیڈر کی حیثیت سے اپنا ایک موثر حلقہ قائم کر چکے تھے۔ مزید برآں اب تک انہوں نے اپنی پارٹی میں کسی دوسرے کو آگے بڑھنے کا مناسب موقع فراہم نہیں کیا بلکہ اس کے

برعکس انہی کی شخصیت کو لیڈر کی حیثیت سے پروجیکٹ ماضی میں بھی کیا اب بھی کیا جارہا ہے لہٰذا وہ آج بھی ایم کیو ایم کے بلاشرکت غیرے لیڈر ہیں اور یہی مہاجر عوام کی بدنصیبی کا سبب بنی ہوئی ہے۔ عوامی لیگ میں گو کہ شیخ مجیب الرحمان کی شخصیت بھاری بھرکم تھی لیکن ان کی پارٹی میں ہر سطح پر تربیت یافتہ سیاست دان موجود تھے۔ مزید برآں شیخ مجیب الرحمان نے اگر تلہ سازش کیس کا سامنا کیا' قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں لیکن اپنے عوام کو کبھی تنہا نہ چھوڑا۔ اس کے برعکس الطاف حسین کا معاملہ یہ ہے کہ مہاجروں کے متفقہ لیڈر ہونے کے باوجود انہیں ہر قدم پر موت پیچھا کرتی ہوئی نظر آتی ہے لہٰذا وہ آج اپنے عوام کے درمیان موجود نہیں اور نہ ان کی غیر حاضری میں ایم کیو ایم میں کوئی ایسی شخصیت موجود ہے جو عوام کی مناسب رہنمائی کر سکے۔ اس صورت حال کی بنا پر سب سے زیادہ نقصان مہاجر عوام کا ہی ہو رہا ہے۔

لسانی بنیادوں پر فسادات

شیخ مجیب الرحمان کو حالانکہ مشرقی پاکستان میں غیر بنگالی مخالفین کا سامنا تھا' جنہوں نے اپنے آپ کو معماران وطن تصور کرتے ہوئے ان کی تحریک کا ساتھ نہیں دیا۔ لیکن فوجی ایکشن کے قبل تک یعنی تقریباً 23 سال کے عرصے میں لسانی بنیادوں پر بنگالیوں میں ایک آدھ جھڑپ تو ضرور ہوئی لیکن کوئی بڑا ہنگامہ نہیں ہوا۔ لہٰذا پاکستان کی سیاسی تاریخ میں اس وقت تک شیخ مجیب الرحمان کو کبھی اس کے لئے مورد الزام نہیں ٹھہرایا گیا۔ البتہ جب غیر بنگالیوں نے آرمی ایکشن کے دوران کھل کر پاکستانی فوج کا ساتھ دیا تو اس کے نتیجے میں لسانی بنیادوں پر فسادات ہوئے اور جہاں غیر بنگالی کمزور پڑے وہاں ان کا صفایا کیا گیا۔ جس کی مثال نارتھ بنگال کے علاقے ایشرڈی' کشٹیا' رنگپور' سیدپور' وبناج پور وغیرہ تھے۔ اس کے برعکس ایم کیو ایم کے آغاز سیاست ہی میں پہلے پختون مہاجر' پھر سندھی مہاجر' اور پنجابی مہاجر فسادات ہوئے جن میں طرفین کے بے شمار افراد قتل ہوئے اور بے تحاشا مالی نقصان ہوا۔

حقوق کی جنگ میں دونوں کی حکمت عملی

مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ نے اقتدار کے حوالے نہ کئے جانے پر مارشل لاء حکومت کی موجودگی میں پرامن عدم تعاون کی تحریک کا ریکارڈ قائم کیا اور یہ ثابت کر دیا کہ کم از کم مشرقی پاکستان کی حد تک ملٹری حکومت کے دور میں اصل اقتدار اسے ہی حاصل تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب لوگوں نے مشرقی پاکستان میں حالات کی خرابی کی بنا پر سرمایہ مغربی پاکستان منتقل کرنا شروع کیا تو عوامی لیگ نے اسٹیٹ بینک سمیت تمام تجارتی بینکوں کو حکم نامہ جاری کر دیا کہ ہفتے میں کوئی شخص اپنے کاؤنٹ سے پانچ سو روپے سے زیادہ نہیں نکال سکتا اور تمام بینکوں نے اس حکم کی تعمیل کی۔ یہ اس عدم تعاون کی تحریک کی ایک چھوٹی سے مثال تھی۔ حکومت وقت نے عوامی لیگ کی اس عدم تعاون کی تحریک کو بغاوت قرار دیتے ہوئے آرمی ایکشن کا آغاز کیا تو عوامی لیگ کے اکثر لیڈر ہندوستان منتقل ہو گئے۔ شیخ مجیب الرحمان کو حکومت پاکستان نے گرفتار کر لیا تھا۔ لیکن اس بدترین صورت حال میں بھی عوامی لیگ کے ارکان اسمبلی نے اسمبلی سیٹوں سے استعفیٰ نہیں دیا تھا۔ ملٹری ایکشن کے نتیجے میں بنگالیوں کا فوج کے ساتھ تصادم ہوا' جس سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان نے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا اور اس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا اور پاکستانی فوج کو ذلت آمیز شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے برعکس جب کراچی میں ملٹری آپریشن شروع ہوا تو پہلے تو ایم کیو ایم کے تمام سرکردہ لیڈر زیر زمین چلے گئے اور بعد ازاں سب نے اسمبلیوں سے استعفیٰ دے دیا۔ آخر میں الطاف حسین بھی لندن چلے گئے اور تاحال وہیں مقیم رہ کر تحریک چلا رہے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں ملٹری ایکشن کے برعکس کراچی میں ملٹری آپریشن ایک سول حکومت کی موجودگی میں اس کے حکم پر کیا گیا۔ اب تک اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس تحریک نے بغاوت کی صورت اختیار نہیں کی لیکن پیپلزپارٹی کی حکومت اسے متواتر مبنی بغاوت کا نام دے رہی ہے۔ لیکن یہ بھی اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ اب تک مہاجر عوام نے انتہائی صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے فوج کے ساتھ تصادم سے گریز کیا ہوا ہے۔

پیپلزپارٹی کا کردار

سقوط ڈھاکہ کے معاملے میں ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی پالیسیوں کا عمل دخل "اظہر من الشمس" ہے جس پر میں کلام کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ بھٹو کی سیاسی حکمت عملی اس کے باوجود کہ پیپلزپارٹی اس وقت اقتدار میں نہیں تھی' ان کے نقطہ نظر سے کامیاب ترین تھی۔ گو کہ اس کے نتیجہ میں دنیا کی سب سے بڑی مسلم مملکت دولخت ہو گئی۔ قدرت کی ستم ظریفی یہ ہے کہ آج بھی پیپلزپارٹی ہی کے دور حکومت میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ بھٹو کی طرح اس کی بیٹی ملک کی وزیراعظم ہے۔ ہانگ کانگ اور جناح پور کے چرچے زبان زد عوام ہیں۔ ع......
الٰہی خیر میرے آشیاں کی۔

پاکستان کا اندرونی خلفشار اور بیرونی طاقتیں

کہا جاتا ہے کہ مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے علیحدہ کرنے کا منصوبہ امریکہ نے بنایا تھا۔ اس زمانے میں منیلا اس بارے میں امریکہ کی سرگرمیوں کا مرکز تھا اور اس وقت کے منیلا میں امریکی سفیر نے مرکزی کردار ادا کیا تھا لیکن بعد میں حالات نے اس کا فائدہ روس کو پہنچایا' جس نے ہندوستان کو آلہ کار بنا کر اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اس ضمن میں اس نے ہندوستان کی حکومت کے ساتھ ایک دفاعی معاہدہ کیا تھا' جس کے نتیجے میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ چھڑی جو بنگلہ دیش کے وجود میں آنے کا سبب بنی۔

آج کا سین یہ ہے کہ امریکہ اللہ کی اس زمین پر سپریم پاور بنا ہوا ہے' جس کی کوشش ہے کہ پاکستان بھی اس کے نیو ورلڈ آرڈر کا حصہ بنے۔ لہٰذا کراچی کی صورت حال کے پیچھے ساری کارفرمائی اسی کی نظر آتی ہے۔ حال ہی میں اخبار میں خبریں آئی تھیں کہ امریکہ نے ہندوستان کی حکومت کے ساتھ ایک دفاعی معاہدہ کیا ہے۔ لہٰذا اندیشہ ہے کہ ایک بار پھر کہیں مشرقی پاکستان کی تاریخ کراچی میں نہ دھرائی جائے۔ ہمارے اکثر سیاست دان اس خدشہ کا اظہار کر رہے ہیں لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اس خیال کے حامی نہیں۔

اس سے پہلے کہ ہم اس مسئلہ پر مزید گفتگو کریں' آیئے ہم ان حالات کا جائزہ لیتے ہیں جن کے نتیجے میں مشرقی پاکستان کے محب وطن عوام میں پاکستان سے علیحدگی کا رجحان پیدا ہوا اور ان حالات کے تناظر میں ہم کراچی کی صورت حال پر نظر ڈالتے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب کی Non Cooperation Movement کو جو یقیناً ایک پرامن تحریک تھی' پاکستان کی حکومت نے بغاوت سے تعبیر کیا لہٰذا 25 مارچ 1971ء کو عوامی لیگ کے خلاف ملٹری ایکشن کا آغاز اس وقت کی مارشل لاء حکومت کے تحت ہوا' اور لیفٹیننٹ جنرل ٹکا خان کو مشرقی پاکستان کا مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بنا کر ایکشن کی نگرانی پر معمور کیا گیا۔

اس ملٹری ایکشن کو پیرا ملٹری فورسز کا تعاون بھی حاصل تھا' جس میں ملیشیا کے علاوہ نئی قائم کردہ East Pakistan Civil Armed Forces کے نوجوان شامل تھے' ان کے علاوہ جماعت اسلامی نے البدر اور الشمس نامی تنظیم قائم کر کے ان کی خدمات بھی فوج کے حوالے کر دی تھیں۔ ان تنظیموں میں مشرقی پاکستان میں آباد غیر بنگالی بھی شامل تھے' جن میں عظیم اکثریت ہندوستان کے صوبے بہار سے ہجرت کر کے وہاں آباد ہو جانے والوں پر مشتمل تھی۔ ملٹری ایکشن کے انداز نے بنگالی عوام کو سخت مایوس کیا اور ان میں پاکستان کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا کیا۔ گاؤں کے گاؤں کو گھیر کر گھروں کو آگ لگانا' لوگوں کے سامان لوٹنا اور خواتین کی بے حرمتی' یہ وہ عوامل تھے جنہوں نے انہیں یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ وہ جسے اپنی فوج سمجھتے ہیں وہ تو "Occupation Forces" کا کردار ادا رہی ہے۔ گو کہ ان حرکات میں فوجیوں کے علاوہ ان کے معاونین بھی شامل تھے لیکن چونکہ وہ بھی فوج ہی کی نگرانی میں کام کر رہے تھے لہٰذا ان کی حرکتوں کی ذمہ داری بھی فوج پر عائد ہوتی تھی۔ پھر بیرونی ذرائع ابلاغ ان واقعات کو نمک مرچ لگا کر بین الاقوامی سطح پر پیش کر رہے تھے۔

اس زمانے میں بھی ملی ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر خبروں کے پیش کرنے کا انداز بالکل ویسا ہی تھا جیسے کہ آج کل ہے لہٰذا عوام بی بی سی اور دور درشن کو سن سن کر متاثر ہو رہے تھے۔ اس بات کا اندازہ آپ اس گفتگو سے لگا سکتے ہیں جو میری وہاں ایک بنگالی کے ساتھ ہوئی۔ اس زمانے میں' میں ایک دن مسلم کمرشل بینک ڈھاکہ کی رمنا برانچ میں بیٹھا تھا۔ وہاں نرسنگدی سے آئے ہوئے ایک بنگالی سے ملاقات ہوئی۔ میں نے جب وہاں کے حالات معلوم کئے تو اس نے بتایا کہ صاحب! "مکتی باہنی والے رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے گاؤں میں داخل ہوتے ہیں۔ فائرنگ کرتے اور کھانے پینے کا سامان لوٹ کر لے جاتے ہیں۔ ان کے جانے کے بعد ہماری فوج آتی ہے' گاؤں کا محاصرہ کرتی ہے اور لوگوں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ ان لوگوں کو جو فائرنگ کر رہے تھے ان کے حوالے کر دیں۔ جب انہیں بتایا جاتا ہے کہ وہ تو بھاگ گئے تو لوگوں کی پٹائی شروع ہو جاتی ہے' لوٹ مار مچائی جاتی ہے اور گھروں کو آگ لگائی جاتی ہے۔ گھروں کو آگ لگائی جاتی ہے۔ ان تمام حرکتوں سے گاؤں والے یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ جب مکتی باہنی اور فوج دونوں ہماری دشمنی پر آمادہ ہیں تو کیوں نہ ہم مکتی باہنی ہی کا ساتھ دیں کہ بہرحال وہ اپنے لوگ ہیں"۔ یہ تھے وہ حالات جن کے تحت بنگالیوں میں علیحدگی کا رجحان پیدا ہوا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اگر 1970ء کے انتخابات کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بحران کے دوران ریفرنڈم کروایا جاتا کہ آیا بنگالی پاکستان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا علیحدہ ہونا چاہتے ہیں تو مجھے یقین ہے کہ بنگالیوں کی عظیم اکثریت پاکستان کے حق میں ووٹ دیتی۔

میں یہ نہیں کہتا کہ بنگالی بڑے معصوم تھے اور ملٹری ایکشن کے نو ماہ کے دوران انہوں نے کوئی ظلم نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ وہ دور تھا جب ہر طاقتور گروہ نے کمزوروں کا قتل عام کیا۔ اس سے کوئی گروہ بھی مستثنیٰ نہیں' خواہ وہ بنگالی ہو' غیر بنگالی ہو یا فوج یا پھر پیرا ملٹری فورس کا کوئی فرد۔ بنگالیوں نے پورے نارتھ بنگال میں آباد غیر بنگالیوں کا' جن میں سے بہتوں نے بنگالیوں کے ساتھ رشتے داریاں قائم کر کے ان کے تہذیب و تمدن کو اپنا لیا تھا' قتل عام کیا۔ دوسری طرف میں نے میرپور' ڈھاکہ اور ریاض الدین بازار اور چاٹگام میں غیر بنگالیوں کے املاک کو نقصان پہنچاتے اور لوٹتے دیکھا ہے۔

بہرحال یہ وہ حالات تھے جن سے ہمارے عیار دشمن بھارت نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ مشرقی پاکستان سے فرار ہونے والوں کے لئے ہندوستان میں پناہ گزین کیمپ قائم ہیں۔ بین الاقوامی سطح پر پاکستان کے خلاف پروپیگنڈا کیا گیا اور آخر میں ہمارے اندرونی خلفشار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پاکستان پر حملہ کیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری فوج کے جوانوں نے بے جگری سے ہندوستانی جارحیت کا مقابلہ کیا۔ میں نے خود پاکستانی Saber Jets کو ہندوستان کے تیز رفتار Hunter طیارے کا پیچھا کرتے ہوئے اور اسے مار گراتے ہوئے دیکھا۔ میں نے فوجیوں کا وہ جذبہ بھی دیکھا ہے کہ وہ مشین گنوں کے ذریعہ SU-7 اور Canbera طیاروں کو نشانہ بنا رہے ہیں اور جس طرح جنگ کے دوران ہمارے گنرز نے گراؤنڈ سے ان طیاروں کا مقابلہ کیا ہے' اس کی تو ساری دنیا نے تعریف کی ہے۔ لیکن افسوس کہ ہمارے سیاست دانوں کی نااہلیوں اور عیاریوں نے نہ صرف ملک کے ٹکڑے کروا دیئے بلکہ ترانوے ہزار فوجیوں کی پیشانی پر شکست کے کلنک کا ٹیکہ بھی لگوایا۔

آج کراچی میں بھی صورت حال کچھ مختلف نہیں۔ گو کہ ڈھائی سالہ ملٹری آپریشن کے دوران بھی عوام کو کافی مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ FIT کے ذریعہ نوجوانوں کی اندھا دھند گرفتاریاں اور ان کے ورثاء کو اطلاع کئے بغیر نامعلوم مقامات پر منتقلی اور اس دوران ان پر تشدد اور پھر بھاری رشوتوں کے عوض ان کی رہائی کوئی کم مصیبت نہیں ہے لیکن چونکہ فوج مشرقی پاکستان کے برعکس کراچی میں سیاسی حکومت کی کال پر لائی گئی ہے لہٰذا معاملہ اس سے آگے نہ بڑھا۔ لیکن اب محاصروں کے نتیجے میں لوگوں کو ذہنی اذیت' ذلت اور رشوتوں کی صورت میں مالی نقصانات کا سامنا ہے۔ اس سے ملک کے معماران کی اولادوں میں پاکستان کے حق میں کوئی نیک جذبہ پیدا نہیں ہو رہا ہے۔ آج مہاجر عوام کی حالت یہ ہے کہ گزشتہ تین برسوں میں کوئی دس ہزار نوجوان قتل ہو چکے ہیں' ہزاروں اپنے گھروں سے دور انڈر گراؤنڈ ہیں۔ اس تمام صورت حال کے نتیجے میں ان کے والدین کے دلوں پر کیا بیت رہی ہے' وہ یا تو وہی جانتے ہیں یا وہ رب ذو الجلال جانتا ہے جس کی نافرمانی کے نتیجے میں آج یہ عذاب ہم پر مسلط ہے۔ اگر اہل اقتدار پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی اسلام کا نظام عدل اجتماعی یہاں جاری کر دیتے تو آج یہ نوبت نہ آتی۔ لیکن ان سمیت عوام کی عظیم اکثریت نے دنیا کی مادی ترقی کو ہی اپنا مطمع نظر بنا لیا جس کا حصول اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے بغیر ممکن ہی نہ تھا۔ اکثر لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا یہ جرم صرف کراچی والوں نے ہی کیا تھا؟ یہ تو اللہ کی علیم و حکیم ہستی جانتی ہے کہ اس میں اس کی کون سی مصلحت

> "جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کراچی مشرقی پاکستان کی طرح اسلام آباد سے ہزاروں میل دور نہیں اور نہ ہی درمیان میں کوئی دشمن ملک حائل ہے' وہ شاید یہ بھول رہے ہیں کہ ہمارا مقابلہ امریکہ کی پشت پر یہودیوں اور اسی کے آلہ کار بھارت جیسے عیار دشمنوں میں سے ہے"

کار فرما ہے البتہ وہ ظالموں کو کبھی معاف نہیں کیا کرتا' خواہ وہ شیخ مجیب الرحمان ہو' ذوالفقار علی بھٹو ہو' اندرا گاندھی ہو یا کوئی اور!! بنگالیوں کو اپنے وقت پر سزا ملی' مہاجروں کو اب مل رہی ہے اور اب جو ظلم کر رہے ہیں انہیں آگے چل کر سزا مل کر رہے گی۔ یہ اللہ کا قانون ہے اور اللہ کی سنت میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔

اب آیئے اس سوال کی جانب کہ کیا مشرقی پاکستان کی طرح کراچی کی ملک سے علیحدگی ممکن ہے؟ اس کا علم تو اس خبیر و علیم ہستی کو ہے جو ہر پل دنیا کے نظام پر اپنی نظر رکھے ہوئے ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایسا ناممکنات میں سے بھی نہیں ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کراچی مشرقی پاکستان کی طرح اسلام آباد سے ہزاروں میل دور نہیں اور نہ ہی درمیان میں کوئی دشمن ملک حائل ہے' وہ شاید یہ بھول رہے ہیں کہ ہمارا مقابلہ امریکہ کی پشت پر یہودیوں اور اسی کے آلہ کار بھارت جیسے عیار دشمنوں سے ہے۔ امریکہ کے تو ویسے بھی ہم نہ صرف معاشی بلکہ سیاسی غلام بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسے دفاعی ٹیکنالوجی میں اتنے وسائل فراہم کئے ہوئے ہیں کہ اس کے ذریعہ کراچی کو بقیہ پاکستان سے کاٹنا ناممکن نہیں ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کراچی کی علیحدگی کی بجائے ایک طویل خانہ جنگی کا اندیشہ ہے' ان کی نظر شاید اس حقیقت پر نہیں ہے کہ گزشتہ تین سال کے عرصے میں حکومت اپنے تمام تر وسائل کو مہاجروں کی نمائندہ تنظیم کے خلاف استعمال کرنے کے باوجود اسے نہ توڑ سکی۔ مہاجر لڑکوں نے رینجرز اور پولیس والوں کو بھی ناکوں چنے چبوا دیئے ہیں تو ان کے لئے اپنے خلاف خانہ جنگی کرنے والوں سے نمٹنا کونسا بڑا کام ہوگا' اگر اس کی نمائندہ تنظیم کی پشت پر امریکہ بہادر کا ہاتھ موجود ہے۔ اور اس کی موجودگی صرف اس حقیقت سے عیاں ہے کہ سعودی عرب جیسے ملک سے جہاں کوئی چھوٹا موٹا اجتماع منعقد کرنا بھی ممکن نہیں' الطاف حسین کا روزانہ وہاں سے گھنٹوں فون پر خطاب ہوتا رہا ہے۔ اور کسے یہ بات معلوم نہیں کہ مشرقی وسطیٰ میں امریکہ کا سب بڑا حلیف سعودی عرب ہے جو اپنے اتحادی امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک کی فوجی طاقت کے ذریعہ عراق کا بھرکس نکلوا چکا ہے۔ ہم تو بہرحال عجمی قوم ہیں۔

آخر میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان حالات میں ملک کو کس طرح بچایا جائے۔ وزیرہ عظمیٰ بے نظیر بھٹو فرماتی ہیں کہ دہشت گردی اور سیاست دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ کاش کہ وہ اپنے عمل سے اسے ثابت بھی کرتیں۔ اپنے زعم میں وہ دہشت گردوں سے ایک فائٹر کی طرح نمٹ رہی ہیں حالانکہ (انہی کی زبان میں) "بزدل چوہوں" سے فائٹر کی طرح نہیں نمٹا جاتا' لیکن مسئلہ کے سیاسی حل کے جانب پیش قدمی کرنے کو بالکل آمادہ نہیں۔ کاش کہ انہیں احساس ہوتا کہ وہ ایک مسلمان ملک کی حکمراں ہیں' جس کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے عوام کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کرے۔ آج کراچی کے عوام کی جان و مال' عزت و آبرو' کچھ بھی محفوظ نہیں۔ انہیں ایک ایسے حاکم کی ضرورت ہے جو ان کے ساتھ انصاف کر سکے۔

اگر بے نظیر بھٹو یہ سمجھتی ہیں کہ ایم کیو ایم کے دہشت گردوں نے مہاجر عوام کو یرغمال بنا رکھا ہے تو یہ ان کا فرض ہے کہ وہ انہیں آزاد کرائیں لیکن یہ نہ تو ایم کیو ایم کے اندر توڑ پھوڑ کر کے ہوگا اور نہ مہاجر عوام کے محاصروں کے نتیجے میں ان کی تذلیل کے ذریعے۔ ان سب کارروائیوں سے ایم کیو ایم کی مقبولیت میں ہرگز کمی واقع نہیں ہوگی بلکہ اس میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا چلا جائے گا اور حکومت کے وہ مخالفین جو یہ کہتے ہیں کہ حکومت اور ایم کیو ایم بر سر زمین تو ایک دوسرے کے مخالف نظر آتے ہیں لیکن حقیقتاً وہ ایک

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام!!

(سٹاک ہم۔ ۲۴/ اپریل) سویڈن کے عدالتی حکام کا خیال ہے کہ مسلمانوں کا اپنے بچوں کا ختنہ کرانا ارتکاب جرم یا اعانت جرم کی زد میں آ سکتا ہے۔ حال ہی میں سویڈن کی ایک عدالت میں ایک مقدمہ دائر ہوا ہے جس میں بغداد یونیورسٹی کے سند یافتہ ایک مصری میڈیکل ڈاکٹر کو جس نے سویڈن میں قائم ایک پناہ گزین کیمپ میں متعدد چھوٹے بچوں کا ختنہ کیا ہے' بچوں کے والدین سمیت اس مجرمانہ حرکت کا ملزم قرار دیا گیا ہے۔

سرکاری وکیل کا کہنا ہے کہ مذکورہ ڈاکٹر اور ان بچوں کے والدین پر ضرر رسانی' حملہ آور ہونے اور جکڑ بندی کا جرم عائد ہوتا ہے۔ ڈاکٹر نے ان چھ بچوں کو جن کی عمریں ایک سال اور پانچ سے سات سال کے درمیان تھیں' زخم پہنچائے جبکہ بچوں کے والدین نے اس دوران انہیں ہلنے تک نہیں دیا۔ بچوں نے چیخ و پکار کر کے اپنا احتجاج درج کرا دیا تھا جو شہادت کے لئے کافی ہے۔ سرکاری وکیل' نلس رکی (Nils Rekke) کا کہنا ہے کہ بعد میں ان بچوں کو جراثیم لگ سکتے تھے' اور پھر یہ کہ بچوں کا زبردستی ختنہ کیا گیا جو کہ صریحاً دست درازی اور تشدد ہے۔ بچوں کے والدین کا جرم یہ ہے کہ وہ اس سازش میں شریک تھے اور یہاں پر حبس بے جا اور حملہ آور ہونے کا جو قانون لاگو ہوتا ہے اس کے تحت ایسا کرنا جرم ہے۔

جن بچوں کا ختنہ کیا گیا تھا ان کے والدین کا تعلق مصر سے ہے اور وہ سویڈن میں پناہ گزین کے طور پر رہ رہے ہیں۔ ایک بچے کے والد نے دہائی دیتے ہوئے کہا کہ ختنہ کی رسم کوئی نئی نہیں ہے۔ بائبل کے دور میں یہ رسم موجود تھی۔ حضرت ابراہیمؑ سے پہلے ہم ایک نسل تھے۔ خود عیسیٰؑ کا بچپن میں ختنہ ہوا۔ اس وقت سویڈن کے طب یا انسداد بے رحمی کے قوانین تو نہیں تھے۔ آج یہ لوگ ایسی باتیں کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر کا تعلق بھی مصر سے ہے' اس کا جرم یہ ہے کہ وہ گھروں میں جا کر جہاں صحت و صفائی کا ماحول نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے' بچوں کو میز پر ڈال کر ختنہ کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ میں نے ہزاروں بچوں کے ختنے کئے ہیں۔ دیہاتوں اور جھگیوں میں جا جا کر۔ اب یہ لوگ مجھے ڈاکٹری سکھا رہے ہیں۔ انہیں اپنے "سرجن" نظر نہیں آتے جو بڑے بڑے ہسپتالوں میں اپریشن کر رہے ہیں' جنہیں کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور مریض جان سے جاتا رہتا ہے۔ ان کے لئے کوئی قانون نہیں ہے؟

(بشکریہ ڈان)

ترجیحات کا تعین

دنیا اور آخرت ہر دو کی کامیابی کیلئے انفرادی اور اجتماعی ہر سطح پر ترجیحات کا تعین ضروری ہے

افسوس کہ مسلمانانِ پاکستان نے پچاس سال کا عرصہ ترجیحات کے تعین کے بغیر گزار دیا

اقتدار احمد مرحوم

کسی فرد کا معاملہ ہو یا اجتماعیت کا' ترجیحات کا تعین عملی زندگی میں نظم وضبط' یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے لازم ہے اور ان میں تقدیم و تاخیر کی ترتیب بھی حادثات کی پیداوار یا موقع و محل کی مناسبت کے تابع نہیں بلکہ سوچی سمجھی اور شعوری طور پر اختیار کردہ ہو تو افراد' جماعتوں اور قوموں کے ذہنی رویہ اور طرز عمل میں یکسانیت' تسلسل اور منطقی ربط خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ترجیحات کی اصل ترتیب عمل سے واضح ہوتی ہے' قول اور دعویٰ اس سلسلے میں معتبر نہیں۔ قول و عمل دونوں میں مطابقت ہو تو کیا ہی کہنا' عملی کوششیں جلد یا بدیر بار آور ہو جاتی ہیں اور ان میں اختلاف ہو تو نہ صرف سعی و جہد لاحاصل رہتی ہے بلکہ زندگی کو ایک مہلک مرض لاحق ہو جاتا ہے جس کا نام نفاق ہے۔

ہم میں سے ہر شخص اپنی انفرادی زندگی کے نقشے پر ایک سرسری نظر ہی ڈال لے اور کسی کو بتانے کے لئے نہیں' اپنی آگہی کے لئے ہی جاننا چاہے تو یہ سمجھنا اس کے لئے دشوار نہ ہو گا کہ اس نے شعوری یا لاشعوری طور پر کن مقاصد کو اولیت' کن کو ثانویت اور کن کو ان دونوں کے بھی بعد رکھا ہوا ہے۔ ایک مسلمان کے لئے اولین ترجیح نجات اخروی اور اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہونا چاہئے۔ دنیا میں اللہ اور اسکے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کلمہ کو بلند کرنا دوسری ترجیح' وطن اور قوم کی قولی و عملی خیرخواہی اور خدمت خلق تیسری ترجیح اور ذاتی زندگی اپنے تمام لوازمات اور سب آسائشوں سمیت چوتھے نمبر پر آتی ہیں۔ یہ ایک مثالی صورت ہے اور اسلام کے دعویدار ہر شخص کو اپنے ارادوں اور معمولات کو اسی پیمانے سے ناپنا چاہئے۔ اس ناپ تول میں ہم ایک حد تک ڈنڈی مار بھی لیں اور اپنے آپ کو بہت سی جا و بے جا رعایتوں کا مستحق بھی قرار دے لیں تب بھی یہ اندازہ تو ہو ہی جائے گا کہ ہم کھڑے کہاں ہیں!۔

اجتماعی طور پر اگر مسلمانوں کو کسی خطہ ارضی پر تمکن یا اقتدار حاصل ہو جائے تو نص قرآنی کے مطابق معاشرے کی ترجیحات بالترتیب قیام صلوٰۃ' ایتائے زکوٰۃ' امربالمعروف اور نہی عن المنکر قرار پاتی ہیں جن کا وسیع تر مفہوم ہے بندگی رب' یعنی اجتماعیت کو ظاہری طور پر بھی اور معنوی اعتبار سے بھی اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں دے دیا جائے گا اور معاشرے میں وہ طہارت و پاکیزگی' مثالی نظم و ضبط اور کامل مساوات اپنی پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہو گی جس کا ظہور

> "ہم میں سے ہر شخص اپنی انفرادی زندگی کے نقشے پر ایک سرسری نظر ہی ڈال لے اور کسی کو بتانے کے لئے نہیں' اپنی آگہی کے لئے ہی جاننا چاہے تو یہ سمجھنا اس کے لئے دشوار نہ ہو گا کہ اس نے شعوری یا لاشعوری طور پر کن مقاصد کو اولیت' کن کو ثانویت اور کن کو ان دونوں کے بھی بعد رکھا ہوا ہے"

نماز باجماعت میں ہوتا ہے' معیشت میں عدل وانصاف کے تقاضے اس خوبصورتی سے پورے کئے جائیں گے کہ دولت کا ارتکاز ختم ہو جائے اور احتیاج کی جڑ کٹ جائے' بھلے کاموں کا اس خوبی سے حکم دیا جائے گا کہ بھلائیوں کو فروغ ہو اور نیکی کی فصل ہر سطح پر لہلہاتی نظر آئے اور برائیوں پر ایسی حکمت کے ساتھ گرفت ہو گی کہ وہ خود ہی دم نہ توڑ دیں بلکہ ان کے انڈے بچے بھی تلف ہو کر رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حد درجہ ناسازگار حالات میں' دو بالا دست دشمن قوتوں کی بھرپور مخاصمت کے علی الرغم اور ہمارے اپنے کرتوتوں سے بھی اغماض برت کر اپنے خاص فضل و کرم سے ہمیں پاکستان جیسے حسین ملک پر اقتدار و تمکن عطا فرمایا تو من الحیث القوم کیا ہم نے یہی ترجیحات اسی ترتیب سے اپنائیں؟۔ افسوس کہ اکتالیس شمسی سالوں سے زیادہ کا زمانہ' جس میں ہماری تیسری نسل معاشرے کی باگ ڈور سنبھالنے کی تیاری کر رہی ہے' اپنی ترجیحات کے تعین پر غور بھی کئے بغیر گذار دیا گیا۔

انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ترجیحات کی جس ترتیب کا ذکر سطور بالا میں ہوا' اس کی صحت سے کون مسلمان انکار کرے گا۔ ہماری قدروں کا ڈھانچہ اسی کے مطابق ہونا چاہئے تھا اور قول و عمل میں اسی کی کارفرمائی مطلوب تھی' لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہوا۔ قول کی حد تک تو ہم نے بڑے سے بڑے بول بولے لیکن عمل میں اس کی جھلک تک نظر نہ آئی۔ اس طرز عمل کا بدترین مظاہرہ پچھلے ایک عشرے میں ہوا اور حالیہ الیکشن بھی اس کی منہ بولتی تصویر ہے۔ ان حالات میں ہمارا لائحہ عمل کیا ہونا چاہئے' جب کہ یہ بات بھی ہم پر پوری طرح روشن ہے کہ اسلام کی دنیوی و اخروی حسنات و برکات کا حصول اسے ایک کل کے طور پر قبول کئے بغیر ممکن نہیں۔ اس کے کسی ایک جز کو اپنانا اور دوسرے کو رد کر دینا غیر مسلموں کو راس آسکتا ہے اور راس آیا نظر بھی آتا ہے۔ لیکن

ایمان کے دعویداروں کے لئے تو اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ آیئے زمینی حقائق کی روشنی میں غور کریں اور سمجھنے کی کوشش کریں کہ عالم واقعہ میں ہم جس صورت حال سے دوچار ہیں' اس میں ہماری خیریت ترجیحات کی کس ترتیب میں ہے ورنہ قول و عمل کا تضاد تو ہمارے نفاق کو گاڑھے سے گاڑھا کئے دے رہا ہے جس میں نہ ہماری دنیا کا بھلا ہے نہ عاقبت کا۔

اس کی وجوہ خواہ کچھ بھی ہوں' ایک سنگین حقیقت یہ ہے کہ ہمارے معاشرے کے عظیم ترحصے یعنی سواداعظم کو اسلام سے عملی تعلق بس اتنا رہ گیا ہے جتنا آٹے میں نمک ہونا چاہئے۔ قولی اور جذباتی وابستگی کے مظاہرے حمد ونعت' میلاد کے جشن وجلوس "درباروں" میں ہجوم اور عرسوں کی رونق'

> **"زکوٰۃ ادا کرنے والے بھی کوئی خلش محسوس کئے بغیر سود کے لین دین سے پھلتے پھولتے ہیں' ہمارے یہ سب بھائی کلمہ گو ہیں اور دولت اسلام سے مالا مال بھی لیکن کمی ہے تو بس ایمان کی اور مشکل یہ ہے کہ ایمان نعروں سے پیدا نہیں ہوتا"**

قل وچہلم کے اہتمام' اور نعروں کی گرم بازاری سے بالعموم آگے نہیں بڑھتے اور عمل کا دائرہ بہت وسیع ہو تب بھی بے سمجھے بوجھے تلاوت قرآن پاک' بے روح نماز' فاقہ کشی کی طرح کے روزے' مارے باندھے زکوٰۃ کی جزوی ادائیگی اور شوقیہ حج و زیارات سے زیادہ اس میں کچھ نہیں سماتا۔ ان عبادات کے ساتھ بڑے سے بڑے منکرات سے پوری رغبت رکھنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا جاتا۔ تفصیل میں جائیں تو بات لمبی ہو جائے گی' اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنے والے بھی کوئی خلش محسوس کئے بغیر سود کے لین دین سے پھلتے پھولتے ہیں۔ ہمارے یہ سب بھائی کلمہ گو ہیں اور دولت اسلام سے مالا مال بھی لیکن کمی ہے تو بس ایمان کی اور مشکل یہ ہے کہ ایمان نعروں سے پیدا نہیں ہوتا' اس کی جوت دل میں جگانے کے لئے پتہ مار کے کام کرنا پڑتا ہے جس کی توفیق ہمارے ہاں بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے معاشرے میں ایسے لوگوں کی ایک جماعت موجود رہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اس قافلے میں ایمان کی متاع تقسیم کرتی رہے' نیکیوں کی ترغیب دے اور برائیوں سے نفرت پیدا کرے۔ پھر جن لوگوں میں اس کام کا داعیہ پیدا ہو انہیں منظم کر کے بنیان مرصوص بنائے اور سب عاجلہ کے پھندوں سے بچتے ہوئے اپنی قوت اور توانائی کو اس وقت تک محفوظ رکھے جب اقدام سے ذریعے تبدیلی لانے کا کوئی حقیقی موقع میسر آئے۔ اس جماعت کی پہلی ترجیح یہی ہو گی۔ اصلاح وفلاح کے دوسرے کام اور سیادت وجمہوریت میں قومی مصالح اس کے پوری تائید و حمایت پانے کے باوجود ترجیحات میں اولیت کے مستحق نہیں۔ ان مراحل کا حق ادا کئے بغیر کوئی بھی اسلامی جماعت مروجہ سیاست کے میدان میں کود کر دین کے حق میں مثبت کام نہیں کر سکتی۔

رہیں بحیثیت مجموعی پاکستانی قوم کی ترجیحات تو خواب میں خیال کا ان سے معاملہ رکھنے کی بجائے حقیقت پسندی سے کام لیا جانا چاہیے۔ اس اعتبار سے ہماری پہلی ترجیح ملک کی بقا و سلامتی ہے تو دوسری ترجیح سیاسی عمل کی روانی اور جمہوریت کی بحالی جو ایک مخصوص پس منظر میں ہم معنی ہو کر رہ گئی ہیں۔ اسلام کا نمبران دو کے بعد آتا ہے۔ ہمیں اندازہ ہے کہ یہ بات کہہ کر ہم اسلام پسندوں کے غیض وغضب کا شکار بنیں گے لیکن سچ کہنے کی یہ قیمت تو ادا کرنی ہو گی۔ البتہ اگر وہ اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھنے کی توفیق پائیں تو ہماری گلو خلاصی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ وہ خود محسوس کر لیں گے کہ اسلام انہیں صرف پسند ہے قبول نہیں۔ اور یہ کیفیت بھی سچے اسلام پسندوں کی ہے' نام نہاد اسلام پسندوں کی نہیں جنہوں نے محض اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے اسلام کا نام جپنا شروع کیا یا اسے ایوان اقتدار تک رسائی کا ایک آسان راستہ سمجھا۔ عوام الناس کا ذکر ہی کیا جن کا حال بیان ہو چکا اور جنہیں اسلام کے علمبرداروں کے قول و عمل نے دین سے کچھ اور برگشتہ ہی کیا ہے۔ ان کی ترجیحات کے ڈھانچے میں حقیقی اسلام کا مقام بہت نیچے رہے گا تا آنکہ ان کے دلوں میں ایمان کا بیج بونے کی محنت کی جائے اور یقین دلایا جائے کہ ان کا دین محض عقائد و رسوم کا مجموعہ اور جنت کا پروانہ نہیں بلکہ دنیوی فلاح و بہبود کی بھی ضمانت ہے۔ یہ یقین دہانی دستوری اور قانونی موشگافیوں سے نہیں ہوگی' غلبہ دین کی خواہش رکھنے والوں کو اسلام کے معاشی عدل و انصاف اور انسانی مساوات کے نظام کو کھول کر بیان کرنا ہو گا۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ ہمیں ہوشمندی سے اپنی ترجیحات کا تعین کرنا چاہئے۔ اس وقت ملک کو جمہوریت کی اور قوم کو جمہوریت کے آداب سیکھنے کی ضرورت ہے۔ اسلام کے نام پر واویلا کر کے سیاسی عمل کو غت ربود کرنا خیر خواہی نہیں۔ ہاں دعا کیجئے کہ ہم میں سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اس توفیق کی ارزانی ہو کہ دین کو اپنی اولین ترجیح بنائیں اور دعا کے ساتھ دوا یعنی کچھ کر کے دکھانے کی ضرورت بھی تو ہے۔OO

(ماخوذ از ہفت روزہ "ندا" ٦ ستمبر ٨٨ء)

بقیہ : واقعاتِ عالم

کے مطالبے سے کنارہ کشی اختیار نہیں کی"۔

بھٹو حکومت نے جب دیکھا کہ ان سے کچھ حاصل نہیں تو طالبان سے فورا پیٹھ پھیر لی۔ آئی۔ ایس۔ آئی جسے اس ساری کارروائی سے دور رکھا گیا تھا' دوبارہ اپنی اہمیت جتانے لگی۔ ایک مغربی سفارت کار کے مطابق "آئی۔ ایس۔ آئی پھر میدان میں اترنے والی ہے" جس کے پیش نظر کابل حکومت کے خلاف طالبان' حکمت یار اور رشید دوستم کا اتحاد قائم کرانا ہے۔ ساتھ ہی "بابری" ٹولہ ایک اور رخ سے' یعنی روم میں مقیم جلاوطن سابق شاہ' ظاہر شاہ کے حوالے سے غور کر رہا ہے۔ شاہ کے داماد' سردار عبدالولی کا گزشتہ ماہ پاکستان کا دورہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ حالانکہ اب تک پاکستانی حکومتیں پختونستان کا مسئلہ چھیڑنے کی بنا پر شاہی خاندان کی خدمت کرتی رہی ہیں۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو' کابل حکومت کو برگشتہ کرنے کے لئے یہ ساری باتیں بہت ہیں۔

آصفی کا کہنا ہے کہ اگر تو ظاہر شاہ کی افغانستان واپسی امن کے قیام کے لئے ایک مخلصانہ کوشش کے طور پر ہے تب تو ٹھیک ہے ورنہ اس کا نتیجہ بھی مختلف نہیں ہو گا۔OO

(بشکریہ : "دی گارڈین" ویکلی' لندن)

کراچی سمیت ہمارے قومی مسائل کا واحد حل : چھوٹے صوبے اور داخلی خود مختاری!!

آج جمہوریت کا مطلب محض انتخابات نہیں' بلکہ سیاسی خود مختاری ہے

بے نظیر بھٹو کا مہاجروں کو ''بزدل چوہے'' کہنا سندھی قوم پرست ہونے کا ثبوت ہے!!

ایم کیو ایم کی بنیاد ضیاء نے نہیں' سندھی وزیر اعظم کی قوم پرستانہ پالیسیوں نے رکھی

تحریر : ایم۔پی۔بھنڈارہ (سابق اقلیتی رکن قومی اسمبلی)

اخذ و ترجمہ : سردار اعوان

جون کے پہلے دو ہفتوں میں کراچی میں ۱۲۴ جانیں دہشت گردوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنیں۔ گزشتہ سال کے ایک ہزار کے مقابلے میں اس سال اب تک ۲۷۰ لوگ لقمہ اجل بن چکے ہیں۔ سوائے سیاست دانوں کے جنہیں اقتدار کی رسہ کشی سے فرصت نہیں ہوتی یا امن عامہ کی ذمہ دار پرانی طرز کی نوکر شاہی اور بعض سندھی قوم پرستوں کے شاید ہی کوئی شخص کراچی کے مسئلے کو امن عامہ کے مسئلے سے زیادہ کچھ سمجھتا ہو۔ دراصل اس مسئلے کی جڑیں بہت دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کا سلسلہ پاکستان کے قیام سے جا کر ملتا ہے۔ بجلی کی چمک کی مانند شدت پسندی بھی ماحول کے اندر موجود کشیدگی کے نتیجے میں ظہور میں آتی ہے جبکہ کشمیر کے بعد کراچی کو برعظیم کا سب سے زیادہ شورش زدہ علاقہ تصور کیا جاتا ہے۔

۲۹ / مئی کے روزنامہ ڈان میں ڈاکٹر اقبال احمد کی ایک تحریر شائع ہوئی تھی جس میں انہوں نے خیال ظاہر کیا تھا کہ ہماری افواج اور رینجر جلد ہی ملیشیا بن کر رہ جائیں گے۔ ان کی یہ بات بالکل صحیح ہے۔ اگرچہ ابھی باقاعدہ گوریلا لڑائی کی نوبت نہیں آئی لیکن اخبارات کے ذریعے ملنے والی تشدد کی اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ جرم اور سزا' قتل اور انتقام اور مجرمانہ کارروائیوں اور آزادی کے لئے جنگ کے درمیان جو باریک سا فرق ہوتا ہے وہ معدوم ہوتا جارہا ہے۔ کراچی کے بعض حصے اجڑ کر رہ گئے ہیں' کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔

اس لڑائی میں ملوث ایک شخص مجرم' ڈاکو یا قاتل ہے یا آزادی کا پروانہ' اس کا انحصار ہر شخص کی اپنی رائے پر ہے۔ ماضی کے قومی ریاست کے شہرۂ آفاق نظریئے کے ساتھ وفاداری' سرد جنگ کے بعد کی ٹوٹ پھوٹ سے دوچار دنیا میں بہت بڑی حماقت کا درجہ اختیار کر گئی ہے۔ نظریاتی ریاست کا تصور سرد جنگ کے ساتھ ہی رخصت ہو گیا ہے۔ مہاجر بالعموم بے نظیر کو سندھی قوم پرستی کی علامت سمجھتے ہیں۔

قصور میں ان کی تقریر سندھی ذہن کی صحیح عکاسی کرتی ہے اور اس سے مہاجروں کے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ بے نظیر جیسے لوگ ان ''بزدل چوہوں'' کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ کراچی اور سندھ میں ہم اس بند گلی میں کیسے آ پھنسے؟ شروع سے آغاز کرتے ہیں' ہم اس برصغیر میں لگ بھگ ایک ہزار سال ہندو کے ساتھ رہے لیکن تقریباً ساٹھ سال قبل ہم نے طے کیا کہ انگریز کے جانے کے بعد ہم ان کے ساتھ ایک قوم کی طرح نہیں رہ سکتے۔ اس طرح دو قومی نظریہ وجود میں آیا۔ دو قومی نظریئے کی رو سے ہندو اور مسلمان کبھی بھی ہندوستان میں ایک نہیں رہے تھے' ہمیشہ دو الگ قوموں کی حیثیت سے رہے ہیں' لہٰذا مطالبہ پاکستان دو قومی نظریئے کا منطقی نتیجہ تھا۔

> ''مہاجر اتنی صلاحیت رکھتے ہیں کہ پاکستان کے اندر کراچی کو سنگاپور بنا دیں' مگر ہم سنگاپور یا ہانگ کانگ کا نام بھی زبان پر لانے سے خوف کھاتے ہیں' حالانکہ سیدھی سی بات ہے کہ اگر آپ کسی طبقے کو دیوار کے ساتھ لگنے پر مجبور کر دیں گے تو بالآخر وہ آپ سے آزادی حاصل کرنے کا نہیں سوچے گا تو کیا کرے گا''

یہ نظریہ ہندوستانی مسلمانوں کو ایک مشترک تشخص اور الگ قوم ہونے کا جواز فراہم کر کے پاکستان کے قیام میں مدد و معاون ثابت ہوا۔ اسی نظریئے کا ایک عملی مظہر یہ سامنے آیا کہ ۱۹۴۷ء میں اتنی بڑی آبادی نے نقل مکانی اختیار کی کہ اس کی مثال تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔ مشرقی پنجاب' یو۔پی' بہار اور دوسرے علاقوں سے ہجرت کر کے آنے والے مسلمانوں کو یقین تھا کہ پاک سرزمین پر قدم رکھتے ہی صدیوں کے استحصال' امتیازی سلوک اور ہندوؤں کی ماتحتی سے نجات مل جائے گی۔ خوشی' جوش و جذبے اور پاکستان کی محبت نے ذہنوں سے اس بات کو بالکل اوجھل کر دیا کہ کبھی اس خوشنما سرزمین میں زبان' رسم و رواج' رہن سہن اور شکل و صورت کو فوقیت حاصل ہو سکتی ہے۔

لگ بھگ چوتھائی صدی' ۱۹۷۰ء تک پرانے اور نئے سندھی باہم امن و آشتی سے رہتے رہے۔ ہوائی

اور بحری راستوں پر واقع ہونے کی وجہ سے کراچی جلد ہی ترک وطن کر کے آنے والوں کے لئے زبردست کشش کا باعث بن گیا۔ مہاجر ہوشیار تو تھا ہی' لہٰذا وقت گزرنے کے ساتھ کراچی اور وہاں کے نظم و نسق پر پوری طرح چھا گیا۔ پرانے سندھی' قدرتی بات ہے کہ اس پر پیچ و تاب کھاتے کہ اچھے مہمان وارد ہوئے کہ گھر والے اجنبی ہو گئے۔

جب تک اصل پاکستان قائم رہا (۱۹۴۷ء-۱۹۷۱ء) پرانا سندھی خاموش رہنے پر مجبور تھا۔ سیاسی دنگل بنگالی اور پنجابی پہلوانوں کے درمیان تھا۔ عددی قوت سے لیس بنگالی کمزور قسم کی نیم وفاقی طرز کی ریاست چاہتا تھا جبکہ پنجابی اور سرکاری فوجی "اشراف" مغربی پاکستان کو یک جا طور پر مشرقی پاکستان کے مقابلے میں لانے کا خواہاں تھا۔ سندھی' سرحدی اور بلوچی قوم پرست یا نیم قوم پرست مشرق' مغرب کی اس لڑائی سے الگ تھلگ سندھو دیش' پختونستان اور دیگر علاقائی تشخص اجاگر کرنے میں لگے رہے۔ اس نفسا نفسی کے عالم میں سندھی اپنی معاشی قوت اور ملازمتوں سے بالکل ہاتھ دھو بیٹھا۔ اسے درحقیقت تین اطراف سے مصیبت نے آ لیا۔ سندھ کے اندر آباد کاروں کے مقابلے میں کم تر حیثیت' مغربی پاکستان میں پنجابی کی حاشیہ برداری پر مجبور اور وفاق میں سب سے کمزور کھلاڑی۔

دسمبر ۱۹۷۱ء میں حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ مشرقی پاکستان علیحدہ ہو گیا اور سندھ کے بھاگ جاگ گئے۔

☆ نیا وزیر اعظم سندھی' جس نے "بحران" کے بہانے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے اختیارات بھی سنبھال لئے تھے۔

☆ مشرقی پاکستان کی علیحدگی سے سابقہ اونچا طبقہ' خصوصاً پنجابی نیچا ہو چکا تھا۔

☆ مہاجر غدار اور بنگالی قوم کے دشمن قرار پا چکے تھے۔ یہ بات سندھی کے دل کو لگی۔

سندھی نے اسلام آباد میں تخت پر قدم رکھتے ہی ہاتھ دکھانا شروع کر دیا۔ ۱۹۷۲ء میں سندھ میں سندھی زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دینے کی تیاریاں ہونے لگیں تاکہ مہاجر خود ہی دوسرے درجے کے شہری ہو کر رہ جائیں۔ مہاجر ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے۔ سندھی کو سرکاری زبان بنانے کی بیل تو منڈھے نہ چڑھ سکی البتہ اپنے منفی اثرات باقی چھوڑ گئی' مہاجر چوکنا ہو گئے اور انہیں اپنی طاقت کا بھی احساس ہو گیا۔

دوسرا کام یہ دکھایا کہ سرکاری ملازمتوں کے لئے کوٹہ سسٹم لاگو کر دیا جس کی رو سے شہری طبقے پر دیہی آباد کاروں کو فوقیت حاصل ہو گئی۔ اس سے طبقاتی تقسیم کا راستہ کھل گیا۔ بھٹو حکومت کے نزدیک' خواہ پہلی ہو یا اب کی' سرکاری ملازمت کے لئے دو ہی شرائط درکار ہیں۔ ایک سندھی ہونا اور دوسری بھٹو خاندان سے وفاداری' اللہ اللہ خیر سلا!

چونکہ پہلا سربراہ حکومت ایک مہاجر تھا اور اردو سرکاری زبان' لہٰذا مہاجروں کے وارے نیارے تھے۔ لیکن جب پاکستان آدھا ہو گیا اور بنگلہ دیشی مہاجروں کا آج تک کوئی والی وارث نہ بنا تو سندھی مہاجر کو اپنی بے کسی اور بے بسی کا احساس ہوا جو بڑھتے بڑھتے ستر کی دہائی کے وسط تک اپنے نقطہ عروج کو پہنچ گیا۔

ایم۔ کیو۔ ایم کیا' کیسے' اور کچھ اس کے کرشماتی لیڈر کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ ایم۔ کیو۔ ایم کا پودا جنرل ضیاء نے لگایا تھا' لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ ۱۹۷۲ء کے لسانی فسادات اور کوٹہ سسٹم لاگو ہونے کے بعد سے مہاجر اپنے مفادات اور تحفظ کے لئے کسی سیاسی سہارے کے متلاشی تھے۔ پرانی دائیں بازو کی مذہبی جماعتیں جو مہاجروں کی نمائندگی کا دم بھرتی رہتی تھیں "بھٹو ازم" کے سامنے دم توڑ چکی تھیں۔ سندھ میں مہاجروں کی حیثیت بے گھر' محنت کش طبقہ کی ہے' جن کی کوئی جڑ بنیاد نہیں' ان کی اکثریت کے لئے زندگی زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ بھٹو اول کے دور (۱۹۷۷-۱۹۷۲ء) میں ہی انہیں اپنے تحفظ کے لئے آمرانہ قسم کی اپنی ایک تنظیم کی ضرورت لاحق تھی جو عموماً نچلے طبقے کو تحفظ کے لئے موزوں سمجھی جاتی ہے۔ کراچی میں بسنے والے مہاجر مایوسی اور بے یقینی کا شکار ایک ہجوم کی شکل اختیار کر چکے تھے جسے جس طرف چاہیں ہانک کر لے جائیں۔

اپریل ۱۹۷۸ء میں بھٹو کو پھانسی دینا سندھی قوم پرستی کی توہین تھی۔ بھٹو دور میں اقتدار کا مزہ چکھ لینے کے بعد ایسی سبکی سندھیوں کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ چنانچہ سندھی لاٹھی کلہاڑی لے کر مارشل لاء کے خلاف میدان میں آ گئے۔ ایم۔ آر۔ ڈی کی تحریک کو جو دراصل سندھی رد عمل کا نتیجہ تھی' ۱۹۸۳ء میں فوج کے ذریعے کچل دیا گیا۔ یہی ایم۔ کیو۔ ایم کے جنم کی شبھ گھڑی تھی۔ بے گھر' محنت کش مہاجر پلک جھپکنے کی دیر میں منظم جماعت میں ڈھل گئے اور اس کے لئے ایک نیم درندہ' نیم سیاستدان قسم کا قائد بھی تلاش کر لیا۔

ایم آر ڈی کی تحریک کو کچلنے کے لئے فوج اور نوزائیدہ ایم۔ کیو۔ ایم کے درمیان بلاشبہ ربط و ضبط اور تعاون موجود رہا مگر یہ کہنا صحیح نہیں کہ ایم۔ کیو۔ ایم فوج کی پیداوار ہے۔ جب بھی کوئی قومی تحریک کچلی جاتی ہے تو اس کی ٹکڑیاں ادھر ادھر موجود رہتی ہیں۔ ۱۹۸۳ء میں سندھی نیشنلزم کے کچلے جانے کے بعد اس سے علیحدہ ہونے والے متعدد گروہوں نے لوٹ مار اور اغوا برائے تاوان کا پیشہ اختیار کر لیا' بعض بھارت کے حلقہ اثر میں چلے گئے۔ سندھی معاشرہ بری طرح ٹوٹ کر رہ گیا۔ ۱۹۸۳ء کے بعد مارشل لاء انتظامیہ کو مجبوراً حکومت میں شہریوں کی شرکت کا اہتمام کرنا پڑا تو ۱۹۸۵ء میں جونیجو حکومت قائم ہوئی۔

اگر دو متحارب قومی دھڑوں کے تناظر میں جو سندھ میں طاقت کے حصول کے لئے کوشاں ہیں' جائزہ لیا جائے تو نہ صرف حالیہ واقعات کو سمجھنے میں آسانی ہو گی ان کے تدارک کے لئے بھی لائحہ عمل ترتیب دیا جا سکتا ہے۔ مہاجروں کے الگ ہونے والے کسی دھڑے کا سرکاری استعمال مسئلے کا حل نہیں ہو سکتا' اس سے الٹا کراچی کی خانہ جنگی میں

> "مشرقی پنجاب' یو۔ پی' بہار اور دوسرے علاقوں سے ہجرت کر کے آنے والے مسلمانوں کو یقین تھا کہ پاک سرزمین پر قدم رکھتے ہی صدیوں کے استحصال' امتیازی سلوک اور ہندوؤں کی ماتحتی سے نجات مل جائے گی۔ خوشی' جوش و جذبے اور پاکستان کی محبت نے ذہنوں سے اس بات کو بالکل اوجھل کر دیا کہ کبھی اس خوشنما سرزمین میں زبان' رسم و رواج' رہن سہن اور شکل و صورت کو فوقیت حاصل ہو سکتی ہے"

درندگی اور کمینگی کو ہوا ملی ہے۔

ہماری ملکی یک جہتی اور اتحاد کو فوری طور پر جو خطرات درپیش ہیں ان سے عہدہ برا ہونے کے لئے پاکستان کا تانا بانا نئے سرے سے بنانا پڑے گا۔ آج اس ملک کو' جس کی آبادی ۱۲۰ ملین سے تجاوز کر رہی ہے اور اگلے ۳۰ سال میں جس کا اندازہ ۲۴۰ ملین ہے' جو شے درکار ہے وہ ہے بہت بڑی مقدار میں اندرونی خود مختاری کا استعمال۔ اس وقت لگ بھگ ۷۵ فیصد اختیارات مرکز کے پاس ہیں باقی ۲۵ فیصد چاروں صوبوں کو حاصل ہیں۔ مرکز کی اس اجارہ داری کے بڑے انوکھے نتائج سامنے آئے ہیں۔ کراچی جو کل آمدنی کا قریباً ۶۰ فیصد حصہ مہیا کرتا ہے' مرکز یا صوبے میں اس کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر ہے۔ موجودہ دستوری ڈھانچے اور سندھ کے انتخابی حلقوں کی حد بندی کے تحت کراچی پر ہمیشہ دیہی سندھ کی حکومت ہو گی۔ کراچی والوں کو تو میونسپلٹی میں بھی نمائندگی نہیں ملتی۔

کراچی تک ہی محدود نہیں' ملتان کو لے لیں۔ تہذیب' زبان' زراعت' آبادی' کس میں کمی ہے۔ لیکن ایک معمولی فیصلہ بھی یہاں نہیں ہو سکتا۔ کسی سکول ہیڈ ماسٹر کا تبادلہ ہے یا کسی جگہ پٹرول پمپ لگانا ہے' لاہور میں فیصلہ ہوتا ہے۔

مہاجر اتنی صلاحیت رکھتے ہیں کہ پاکستان کے اندر کراچی کو سنگا پور بنا دیں' مگر ہم سنگاپور یا ہانگ کانگ کا نام بھی زبان پر لانے سے خوف کھاتے ہیں' حالانکہ سیدھی سی بات ہے کہ اگر آپ کسی طبقے کو دیوار کے ساتھ لگنے پر مجبور کردیں گے تو بالا خر وہ آپ سے آزادی حاصل کرنے کا نہیں سوچے گا تو کیا کرے گا۔ آج نہیں تو کل ہمیں پاکستان کے اندر نئے یونٹ تشکیل دینا پڑیں گے۔ البتہ جتنی تاخیر کریں گے اتنا ہی لوگوں کا جمہوریت پر سے اعتماد اٹھتا چلا جائے گا۔

موجودہ سیاسی اداروں کی صفائی ستھرائی کے علاوہ مزید صوبے ہماری ناگزیر ضرورت بن چکے ہیں لیکن اگر سندھ سے کاٹ کر صرف کراچی کو الگ صوبہ بنایا گیا تو یہ سراسر زیادتی ہو گی۔ یہ کام باقاعدہ کلئے کے تحت طے پانا چاہئے۔ موجودہ صوبوں میں ہر ایک کے تین تین صوبے بنا دیئے جائیں البتہ نئی حدیں گروہی یا لسانی بنیادوں کی بجائے موجودہ کمشنریوں کے حوالے سے مقرر کی جائیں۔

تصور اور تجربہ یکسر تبدیل ہو رہا ہے' جمہوریت سے مراد اب گروہی اور علاقائی آزادی لیا جا رہا ہے۔ اگرچہ آج یہ تصور تیسری دنیا کے تمام ممالک میں ایک لعنت سے کم نہیں۔ کیوبک (Quehec) کے استصواب سے' جو اس سال متوقع ہے اور جس میں وہاں کے لوگ یہ طے کریں گے کہ وہ کینیڈا میں شامل رہنا چاہتے ہیں یا اس سے الگ ہونا چاہتے ہیں' یقیناً دوسروں کے لئے راستہ کھل جائے گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایک پرانے علاقائی جھگڑے کو حل کرنے کا اس سے بہتر جمہوری اور شریفانہ طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟

آج کی دنیا میں جمہوریت محض انتخابات کا نام نہیں' لوگ خود مختاری مانگتے ہیں۔ کیا ایک کشمیری' سکھ یا تامل کو آپ انتخابات کا جھانسہ دے کر مطمئن کر سکتے ہیں؟ ہم سے زیادہ کون اس بات سے واقف ہو سکتا ہے' اگر ہم مشرقی پاکستان کو خود مختاری دینے سے انکار نہ کرتے تو کیا وہ ہم سے الگ ہونے کا سوچتے؟

جہاں تک دہشت گردی کے الزام کا تعلق ہے۔ اس صدی کے بعض مشہور دہشت گرد بعد میں حکمران رہے ہیں۔ ایمن ڈی ویلیرا' شالن اور چو این لائی۔ یہ تین نام تو سامنے کے ہیں۔

آج مہاجر پاکستان میں رہنا چاہتے ہیں' ہم انہیں نہیں رہنے دے رہے!!۔

(بشکریہ روزنامہ "ڈان")

اعلان داخلہ - قرآن کالج لاہور

① ایک سالہ "رجوع الی القرآن" کورس

قرآن کالج' لاہور میں ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس میں داخلہ شروع ہے۔ جو اصحاب اپنی کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم مکمل کر چکے ہوں اور دین کی بنیادی تعلیم (جس میں عربی گرامر' تجوید' مطالعہ قرآن حکیم اور احادیث مبارکہ کا ایک منتخب نصاب اور ترجمہ قرآن حکیم شامل ہے) حاصل کرنے کے خواہش مند ہوں' ان کے لئے یہ ایک نادر موقع ہے۔ انڈر گرایجویٹ اصحاب کے داخلے پر بھی غور ہو سکتا ہے۔

- داخلے ستمبر کے آخر تک مکمل ہو جائیں گے اور تدریس کا آغاز ان شاء اللہ شروع اکتوبر سے ہو گا۔
- داخلہ فارم ۲۱ ستمبر تک وصول کئے جائیں گے۔ داخلہ فارم موصول ہونے پر انٹرویو کی تاریخ سے بذریعہ ڈاک مطلع کر دیا جائے گا۔

تفصیلات کے لئے پندرہ روپے کے ڈاک ٹکٹ بھیج کر پراسپکٹس طلب کریں

② بی۔اے' تربیتی سال

قرآن کالج' لاہور میں بی۔اے (تربیتی سال) کے لئے بھی داخلے جاری ہیں۔ داخلے ستمبر کے آخر تک مکمل کر لئے جائیں گے۔ داخلہ فارم ۲۱ ستمبر تک موصول ہو جانا چاہئے۔

- داخلہ فارم موصول ہونے پر انٹرویو کی تاریخ سے بذریعہ ڈاک مطلع کر دیا جائے گا۔
- انٹر کے نتیجے کے منتظر طلبا بھی درخواست دے سکتے ہیں۔
- کالج میں بی۔اے کے طلبہ کے لئے کمپیوٹر کی تعلیم کی سہولت بھی موجود ہے۔

تفصیلات کے لئے پندرہ روپے کے ڈاک ٹکٹ بھیج کر پراسپکٹس طلب کریں

ـــــ نوٹ ـــــ

مندرجہ بالا دونوں کورسوں میں طلبہ کیلئے میرٹ کی بنا پر ایک ایک وظیفہ بھی دستیاب ہے!

المعلن : پرنسپل' قرآن کالج' لاہور' ۱۹۱۔اتاترک بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن

احیاءِ اسلام کا نقطۂ آغاز پاکستان ہو گا!!

اسلامی انقلاب نبوی طریق کار پر چل کر ہی برپا کیا جا سکے گا

حضورؐ کا مقصدِ بعثت تب پورا ہو گا' جب پوری دنیا پر نظامِ خلافت قائم ہو جائے گا

معاصر ماہنامہ "ارقم" میں شائع ہونے والا امیرِ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا انٹرویو

انجمن خدام القرآن کے صدر اور تنظیم اسلامی کے امیر جناب ڈاکٹر اسرار احمد معروف دینی سکالر ہیں۔ آپ کی پوری زندگی اقامت دین کی جدوجہد میں گزری۔ ایک طرف قرآن کالجز' قرآن اکیڈمیوں کا قیام اور دورہ ہائے ترجمہ قرآن آپ کی خدمت قرآن کا اظہار ہیں اور دوسری طرف اقامت دین کے لئے انقلابی طریق کار پر قائم جماعت' تنظیم اسلامی کے بانی امیر ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور دو ماہانہ جرائد حکمت قرآن اور میثاق کے مدیر مسئول ہیں۔ گذشتہ دنوں ہم نے سرگودھا میں "ارقم" کے لئے ان کی گفتگو کی جو نذر قارئین ہے۔

✱ اس برس ربیع الاول اور ماہ اگست اکٹھے آ رہے ہیں۔ رسول اللہ کے ارشادات کی روشنی میں اور آپ ﷺ کو پیشین گوئیوں کے آئینے میں پاکستان کا کیا مقام متعین ہوتا ہے اور اس حوالے سے اہل پاکستان کی ذمہ داری کیا ہے؟

● حضور ﷺ کی پیشین گوئیوں سے پہلے قرآن مجید کے حوالے سے ایک بات کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ حضور ﷺ کی بعثت کا مقصد غلبہ دین ہے جو قرآن مجید میں تین مقامات پر متعین کیا گیا ہے' یہ صغریٰ ہے۔ اور کبریٰ کو جوڑ کر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب تک پورے عالم انسانیت پر دین حق کا غلبہ نہیں ہوتا' حضور ﷺ کا مقصد بعثت ابھی پورا نہیں ہوا اور یہ محال ہے کہ دنیا حضور ﷺ کے مقصد بعثت کی تکمیل سے پہلے ختم ہو جائے۔ حدیث سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ پورے عالم انسانیت پر دین کا غلبہ ہو گا اور اسی کی پیشین گوئیاں ہیں۔ حضرت نعمانؓ بن بشیر کی حدیث ہے کہ حضور ﷺ نے اپنے دور سے شروع کر کے پانچ ادوار گنائے ہیں۔ دور نبوت' دور خلافت علیٰ منہاج النبوۃ' کٹ کھنی بادشاہت' پھر مجبوری والی بادشاہت جسے میں سمجھتا ہوں کہ غیر مسلموں کی بادشاہت۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا دوبارہ خلافت قائم ہو گی۔ حضرت ثوبانؓ کی حدیث جو مسلم شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ساری زمین لپیٹ کر دکھا دی۔ میں نے سارے مشرق' سارے مغرب دیکھ لئے اور میری امت تمام علاقے پر غالب ہو کر رہے گی جو مجھے دکھائی دیا۔ حضرت مقدادؓ سے روایت ہے کہ اس روئے زمین پر کوئی گھر نہیں بچے گا نہ گارے کا بنا ہوا اور نہ ہی کوئی کمبلوں کا بنا ہوا خیمہ کہ جس میں اسلام داخل نہ ہو جائے' چاہے وہ کسی عزت والے کو اعزاز کے ساتھ داخل کرے اور چاہے کوئی کمزور اپنی مغلوبیت کے ساتھ داخل ہو یعنی یا تو وہ اسلام قبول کرے گا یا اسلام کا محکوم ہو کر رہے گا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ حضور ﷺ کی پہلی حدیث کی روشنی میں چوتھے دور میں ابھی ہم چل رہے ہیں۔ دور جبر کی ایک شکل ختم ہوئی ہے لیکن ابھی دوسری شکل سیلاب کی طرح سے آ رہی ہے جو امریکہ کا نیو ورلڈ آرڈر ہے' جو حقیقت میں جیو (Jew) ورلڈ آرڈر ہے اور یہ مالیاتی تسلط ہے۔

اسلام کا جو احیاء (Revival) ہو گا اس کا یقیناً کوئی نکتہ آغاز تو ہو گا۔ اس کے بارے میں جو پیشین گوئیاں ملتی ہیں ایک تو مشرق کا لفظ آتا ہے کہ "مشرق سے وہ فوجیں آئیں گی جو مہدی کی فوجوں کو Support کریں گی" اور یہ کہ "خراسان سے سیاہ جھنڈے برآمد ہوں گے وہ چلتے جائیں گے اور انہیں کوئی نہیں روک سکے گا۔ یہاں تک کہ وہ ایلیا میں (یروشلم میں) جا کر نصب ہو جائیں گے" یروشلم پہلے بھی مسلمانوں کے ہاتھوں سے گیا تھا تو اسے عرب واپس نہ لے سکے تھے بلکہ کردوں نے اسے واپس لیا تھا۔ اب بھی نکلا ہے تو خراسان کی طرف سے فوجیں آئیں گی اور خراسان جو حضور ﷺ کے زمانے میں تھا اس میں موجودہ افغانستان' تھوڑا سا ایران اور

> **پاکستان چودہ سو سال کی تجدیدی مساعی کا امین ہے۔ تقسیم ہندوستان نے اسلام کے نقاو کی ذمہ داری ہمارے کندھوں پر ڈال دی ہے**

پاکستان کا پختون بیلٹ بھی اس کا حصہ ہے اور کچھ ترکستان کا علاقہ' یہ تو ہے احادیث کے حوالے سے۔

دوسرا میرے سامنے جو تاریخی پس منظر ہے کہ ختم نبوت کے بعد ہمارے ہاں مجددین ہی کا سلسلہ ہے۔ ایک ہزار برس تک سارے مجددین عالم عرب میں پیدا ہوئے۔ جیسے ہی دوسرا ہزارواں سال شروع ہوا یہ Centre Of Gravity برصغیر میں شفٹ ہو گیا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی' شاہ ولی اللہ' سید احمد بریلوی اور پھر چودھویں صدی میں جو رجال ہندوستان

"ساری سنی دنیا بھٹک ہی اس لئے رہی ہے کہ اس کے سامنے دو ہی راستے ہیں' بیلٹ یا بلٹ!!"

نے پیدا کئے ان کا دنیا میں کوئی نعم البدل نہیں۔ اقبال جیسا مفکر' مولانا مودودی جیسا مصنف' مولانا الیاس جیسا مبلغ' شیخ الہند جیسا طبقہ علماء سے مجاہد حریت۔ بارھویں صدی میں شاہ ولی اللہ کے Counterpart شیخ محمد بن عبدالوہاب ہیں' اسی طرح مولانا مودودی کے Counterpart عرب دنیا میں حسن البنا شہید تھے لیکن یہ دونوں فکری و علمی اعتبار سے شاہ ولی اللہ اور مولانا مودودی کے پائے کے نہیں ہیں۔ اقبال کا تو سرے سے Counterpart ہے ہی نہیں۔ پھر ہندوستان ہی سے ایک تحریک پورے عالم اسلام میں پھیل گئی ہے۔ تبلیغی جماعت یہاں سے شروع ہوتی ہے اور جماعت اسلامی کا فکر پورے عالم اسلام میں پھیلا ہے۔ اس حوالے سے میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی اپنی مشیت ہے کہ کوئی کام لیا جانا ہے جو اس خطے سے وابستہ ہوگا۔

پھر پوری دنیا میں جو Third World Phenomenon ہے' آزادی کی جو تحریکیں چلی ہیں ان میں کہیں اور مذہب کا نام نہیں لیا گیا سوائے پاکستان کے کہ "پاکستان کا مطلب کیا لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ" اور یہاں قرار داد مقاصد منظور ہوئی جو ایک معجزہ ہے کہ دس کروڑ عوام نے اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کیا اِس حوالے سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ چار سو سال کی تجدیدی مساعی کے اس وقت ہم امین ہیں۔ تقسیم ہند نے ساری ذمہ داری ہمارے کندھوں پر ڈال دی ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے گویا اپنا فرض کفایہ ادا کر دیا۔ انہوں نے قربانیاں دی ہیں اور اب بھی دے رہے ہیں۔ ہندو ان کو قیام پاکستان کا جرم معاف کرنے پر تیار نہیں ہے' انہیں اب بھی اس کی قیمت چکانی پڑ رہی ہے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ نکتہ آغاز یہیں سے ہوگا (ان شاء اللہ) گو کہ ہم بھٹک سے گئے ہیں۔

✱ آپ کی فکر یہ ہے کہ اب جو عالمی سطح پر جنگ ہوگی جس میں اسلام کو غلبہ حاصل ہوگا عرب میں ہونے والی اس جنگ میں اگر خراسان لشکر نکلیں گے تو اس کے لئے کیا ضروری ہے کہ یہاں نظام تبدیل ہو۔ وہ لوگ جن کی اس علاقے میں جہاد کی تربیت ہوئی وہ بھی تو مدد کے لئے نکل سکتے ہیں۔ جبکہ آپ نے اپنی جماعت کو عسکری تربیت تو نہیں دی تو کیا آپ اس جہاد سے لاتعلق نہ رہ جائیں گے؟

● لشکر اس طرح نہیں نکلا کرتے۔ فوجوں کی جو شکل ہے وہ تو ایک Formation ہوتی ہے۔ اس لئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہاں پہلے انقلاب برپا ہوگا اور وہاں عربوں کے لئے اللہ کی طرف سے آخری سزا ہوگی۔ حدیث کے مطابق امت اس راستے پر چلے گی جس پر یہودی اور عیسائی چلے۔ اس صدی میں جو یہودیوں کے ساتھ ہوا ہے اس کا Counterpart ابھی ہونا ہے۔ اس کی خبر احادیث میں ہے۔ عظیم ترین جنگ جو ہونی ہے جس کا حضرت یوحنا کے مکاشفات میں ذکر ہے وہ تو سزا ہے جس کے کوڑے پڑیں گے۔ اصل میں ۱۲۵۸ء میں سقوط بغداد کے بعد سے امت' عرب قیادت سے محروم کر دی گئی ہے۔ اس کے بعد یہ قیادت ترکوں کے پاس چلی گئی۔

> **انقلابی جدوجہد کا سلسلہ صرف حضور اکرم ﷺ کے ذریعے مکمل ہوا ہے' اب اگر غلبہ دین سامنے ہے تو یہی اسوہ سامنے رکھنا ہو گا**

ہندوستان کے ایک عالم شمس نوید عثمانی نے جو حال ہی میں فوت ہوئے ہیں انہوں نے ایک کتاب لکھی ہے "اگر اب بھی نہ جاگے تو ---" ان کے مقالے سے میں اتفاق کرتا ہوں کہ اصل میں امت مسلمہ کی قیادت حضرت نوحؑ کے تیسرے بیٹے کی نسل میں چلی جائے گی۔ عرب سامی النسل ہیں۔ کرد یافث کی نسل سے ہیں اور سندھ و ہند اور قبط و سوڈان حام کی نسل میں سے ہیں۔ اب سوڈان میں بھی احیاء دیکھا جا رہا ہے (واللہ اعلم) یہ صرف اندازے ہیں۔ بہرحال ہمیں جو کام کرنا ہے اپنے احساس فرض دینی کے تحت کرنا ہے۔ یہ ساری چیزیں Marginal ہیں' ہمارے جذبے کو بڑھا دینے والی' ہمت دلانے والی' اصل میں تو ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ ہمارا دینی فریضہ کیا ہے۔

✱ قرارداد مقاصد منظور ہو جانے کے بعد جب کہ پاکستان ایک مسلمان ریاست ہے' جسے آپ زیادہ سے زیادہ منافق معاشرہ کہہ سکتے ہیں' کیا ایسے معاشرے میں انقلابی جد و جہد کا جواز ہے اور کیا ایسے معاشرے میں انقلاب کا امکان ہے؟ جبکہ انقلاب ہمیشہ منکر معاشرے میں آتا ہے۔

● انقلاب تو ہر جگہ آ سکتا ہے۔ اگر انقلاب ایران میں آیا ہے تو وہ پہلے سے مسلمان معاشرہ تھا۔

✱ وہ تو ایک حد تک انکار کو پہنچ گئے تھے جب کہ ہمارے ہاں اسلام کی بات پر لوگ زبان سے تو آمنا و صدقنا کہہ دیتے ہیں۔

● نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ منکرات ہمارے ہاں بہت آگے پہنچ گئے ہیں۔ فرقہ واریت ہے۔ ہمارے حالات ایران سے بھی بدتر ہیں۔ ایران کبھی براہ راست غلام نہیں رہا۔ غلامی کے باعث ہمارے ادارے ٹوٹ پھوٹ گئے۔ وہاں پر تو ایک مذہبی نظام بھی تھا۔ یہ تو ایک تقابل کی بات ہے۔ میرے نزدیک انقلاب اس سے رکتا نہیں ہے اور جب میں اس کے لئے ایک یک طرفہ جنگ کی بات کر رہا ہوں تو اس میں فقہی اعتبار سے بھی کوئی قباحت نہیں ہے۔ میں تو خروج کو جائز سمجھنے کے باوجود سمجھتا ہوں کہ اس کا امکان نہیں ہے بلکہ میری تحقیق تو یہ ہے کہ ساری سنی دنیا بھٹک ہی اس لئے رہی ہے کہ اس کے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ بیلٹ یا بلٹ۔ بیلٹ سے جہاں مایوسی ہوتی ہے وہاں ---- حالانکہ درمیان کا ایک راستہ موجود ہے اور وہ ہے ایک منظم' پرعزم احتجاجی تحریک۔ اس میں بلٹ چلانے کی ذمہ داری ہم نہیں لیں گے ہمارے اوپر بلٹ چلیں۔ اسلام کا قیام صرف ایک مرتبہ ہوا ہے۔ حضور ﷺ ہی کے دست مبارک سے ہوا ہے کسی اور نبی یا رسول کے دست مبارک سے بھی نہیں ہوا۔ اگر مذکورہ پیشین گوئیاں موجود نہ ہوتیں تو میں تسلیم نہ کرتا کہ ایسا دوبارہ ہو سکتا ہے۔ وہ ہونا ہے مگر وہ ہوگا اسی طریقے سے۔

✱ ایک مسلمان معاشرے کے لئے حضور ﷺ کی حیثیت تین آیات ہی میں بیان کی گئی کہ آپ ﷺ ان کے لئے آیات کی تلاوت کرتے ہیں' تزکیہ کرتے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں تو کیا تعلیم و تزکیہ کو صرف اپنی جماعت کے لئے محدود کر دینا چاہئے یا سارے مسلمانوں کے لئے تعلیم و تزکیہ کا اہتمام کرنا چاہئے؟

● سوال یہ ہے کہ جو تربیت کا طالب ہو گا اسی کو تو آپ تربیت دیں گے ناں۔ اگر آپ غیر جماعتی طور پر کرتے ہیں تو آپ بھی تو آخر اشتہار دیتے ہیں لوگ آتے ہیں انہی کا تزکیہ کرتے ہیں ناں۔ اس طرح ہماری دعوت میں یتلوا علیهم آیاتہ تو سب کے لئے ہے۔ اس میں کوئی تخصیص نہیں۔ میں نے پورے لاہور میں حلقہ ہائے دورۂ قرآن کا جال پھیلایا ہے۔ ابتداءً سات برس میں نے یہی کام کیا۔ اب صاف ظاہر ہے جو لوگ کسی نظم کے اندر آتے ہیں' جو بھی آئے' انہی کے تعلیم و تزکیہ کا اہتمام ہو سکتا ہے ناں۔ لیکن میرے نزدیک یہ ساری دعوت Revolution Oriented (انقلابی مزاج کی حامل) ہونی چاہئے۔ ورنہ تبلیغ بہت بڑے پیمانے پر تبلیغی جماعت کر رہی ہے۔ اگر ہمارے پاس کوئی ذریعہ ہو کہ ہم سارے گلوب کو دیکھ سکیں تو ہر وقت ایک لاکھ آدمی (متحرک) On The Move ہیں'

امام ہے تو وہ بھی الجماعت کا فرد ہے چاہے کسی طبقے سے اس کا تعلق نہ ہو۔ اس صورت میں الجماعت ایک جماعت ہو گی۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

● الجماعت ایک سے زیادہ ہو ہی نہیں سکتی۔ الجماعت اس کو کہیں گے جس سے باہر کفر ہو اور اسلام صرف اس کے اندر ہو۔ یہ الجماعت یا تو صرف نبی کی ہوتی ہے یا نبی ﷺ کے بعد اس وقت تک تھی جب تک کہ ہمارا دینی اور سیاسی نظام ایک تھے۔ اس کے بعد وہ الجماعت ہے ہی نہیں۔ اس لئے کہ حضرت عمرؓ کا اثر ہے لا اسلام الا بالجماعة ولا جماعة الا بالامارة ولا امارة الا بالسمع ولا سمع الا بالطاعة (اسلام ہے ہی نہیں جماعت کے بغیر' اور جماعت نہیں امارت کے بغیر' اور امارت نہیں سمع کے بغیر' اور سمع نہیں طاعت کے بغیر)۔ الجماعة دوبارہ قائم ہو گی۔ جماعتیں بے شمار ہو سکتی ہیں اور میرے نزدیک یہی سورۃ آل

اسوہ سامنے رکھنا ہو گا۔ البتہ دوسرے اسوہ کو بھی ہم حرام نہیں کہیں گے۔ مثلاً مسلم لیگ نے مسلمانانِ ہند کے لئے جو سوچا تو اسے میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ اسوۂ موسوی ﷺ ہے۔ ہم کہتے ہیں اس سے اسلام نہیں آئے گا لیکن مسلمانوں کی بہبود کا کام بھی کوئی حرام کام نہیں ہے۔ اسی طرح حضرت مسیحؑ کا اسوہ تبلیغی جماعت میں نظر آتا ہے۔ ہم غلط تو نہیں کہیں گے۔ لیکن لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ (تمہارے لئے رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے)

✱ اسلامی نظام تعلیم سے کیا یہی مراد ہو گا کہ مروجہ تعلیم کے ساتھ قرآن مجید اور سنت رسول ﷺ کی تعلیم کو شامل کر دیا جائے یا تمام علوم کو اسلامائز کیا جائے گا؟

● تمام علوم اسلامائز ہوں گے۔ سائنسی علوم میں تو ایک اللہ کی ہستی کا تصور بحال کر دینا کافی ہو گا۔ یہی

"کوئی انقلابی تحریک ذہین طبقے کو نظر انداز کر ہی نہیں سکتی' افکار و نظریات کا مقابلہ کرنا ہو گا"

at any given Movement ۔ اس کے بڑے فوائد بھی ہیں۔ ہم نے بھی سات برس تبلیغ ہی کی ہے لیکن میں نے دو چیزوں میں فرق کیا ہے اور ہمیشہ اسے باہر کی مثال سے واضح کیا ہے۔ ایک ہے مشنری تبلیغ جو عیسائی کرتے رہے ہیں۔ بدترین صحراؤں اور جنگلات میں جا کر ڈیرے ڈالے۔ گو Colonial Powers نے انہیں استعمال کیا لیکن as such مشنری activities کے سامنے کوئی انقلاب ہی نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس ایک تبلیغ کیمونسٹوں کی تھی۔ لیکن اس کی Orientation انقلاب کی ہے۔ میں درخت کی مثال دیا کرتا ہوں کہ آم کا درخت جب دو پتیاں بھی اس کی نکلتی ہیں تو ان کا رخ اوپر کی طرف ہوتا ہے۔ پودا اوپر اٹھے گا اوپر جا کر پھیلے گا۔ جبکہ خربوزے کی بیل زمین ہی پر پھیلتی ہے۔ تو جو مشنری تبلیغ ہے وہ زمین پر پھیلنے والی شے ہے اور جو Revolutionary تبلیغ ہے وہ اوپر اٹھتی ہے اور اوپر جا کر پھیلتی ہے۔

✱ عربی قواعد کے اعتبار سے "الجماعت" ایک سے زائد کیسے ہو سکتی ہیں؟ ایک رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کا سیاسی اقتدار الجماعت ہے جبکہ دوسری رائے یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جو شخص دینی فکر کے ساتھ منسلک ہے' مسجد اس کا مرکز ہے' قرآن اس کا

عمران کی آیت ۱۱۰ سے مراد ہے کہ وہاں پوری امت کو بہترین امت کہا گیا تو اس وقت کے متعلق جب الجماعت تھی اور آیت ۱۰۴ میں کہا گیا کہ تم میں ایک جماعت ہونی چاہئے تو وہ ہمارے موجودہ حالات کے بارے میں ہے۔ ہماری یہ جماعتیں' الجماعت کے اندر مختلف جماعتیں ہیں جس طرح کہتے ہیں in state Stateswith

✱ کیا موجودہ حالات میں جبکہ حالات وہ نہیں جو حضور ﷺ کے دور میں تھے اقامت دین کے لئے دیگر انبیاء کرامؑ کی سیرتوں سے بھی جو قرآن میں بیان کی گئیں رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ جبکہ حضور ﷺ سے بھی کہا گیا کہ فبھداھم اقتدہ (ان انبیاء کے راستے کی پیروی کیجئے)

● فبھداھم اقتدہ سے مراد تو وہ بنیادی ہدایت ہے جس کو ایمان کہتے ہیں جو سب انبیاء و رسل کا متفقہ ہے۔ شریعت و منہاج الگ الگ ہے۔ سابقہ شریعتیں تو منسوخ ہو چکی ہیں۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ اگر موسیٰ علیہ السلام بھی اس وقت زندہ ہوتے تو میری ہی پیروی کرتے۔ اس اعتبار سے ہمارے لئے اصل اسوہ' اسوۂ محمدی ﷺ ہے۔ انقلابی جدوجہد کا سلسلہ صرف حضور ﷺ ہی کے ذریعے مکمل ہوا ہے اب اگر غلبہ دین سامنے ہے تو یہی

کہ طالب علم کو سمجھا دیا جائے کہ جو بھی کائنات میں نظام چل رہا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق چل رہا ہے۔ گویا سائنس میں ایک ایسی ہستی کو add کر دینا کہ جس کا "یہ قانون ہے"۔ یہ بچے کے ذہن میں شروع سے بیٹھ جائے تو ساری سائنس تو جوں کی توں مسلمان ہو گئی۔ سوشل سائنسز میں البتہ محنت کرنا پڑے گی کہ اس کے رگ و پے میں الحاد سرایت کئے ہوئے ہے۔ انہیں تو اسلامائز کئے بغیر آگے نہیں پڑھایا جا سکتا۔ of knowledge Islamisation بہت ضروری ہے۔

✱ کیا یہ کام اب بھی ہونا چاہئے یا کہ اسے انقلاب کے بعد تک کے لئے چھوڑ دیا جائے؟

● نہیں! یہ کام تو اب بھی ہو رہا ہے۔ فکری کام مولانا مودودی نے کیا ہے اگرچہ وہ کام اس کے بعد رک گیا ہے لیکن اس وقت ایک ادارہ امریکہ میں کام کر رہا ہے اور مختلف جگہ پر کام ہوا ہے۔ یہ کام تو تحریک کا لازمی تقاضا ہے کیونکہ انقلابی کام تو ہمیشہ اولاً ذہین طبقے (Intelligencia) پر Focus کرتا ہے' وہ ان میں مضبوط جڑیں جما کر نیچے کی طرف آتا ہے۔ اس لئے کوئی انقلابی تحریک (Educated Elite) یا ذہین طبقے کو by-pass تو کر ہی نہیں سکتی۔ آپ کو

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

اقتدار..... جستجو اور لگن کا ایک پیکرِ عجب

دینی ہی نہیں دنیاوی کامیابیوں نے بھی اقتدار مرحوم کے قدم چومے

سید مشکور حسین یادؔ

سعی و جہد اور صبر و استقلال نے ان کی زندگی میں ایک عجیب نکھار پیدا کر دیا تھا

میں عزیز مرحوم اقتدار احمد سے جب بھی ملتا تو عموماً یہی کہا کرتا تھا کہ "بھئی آپ کتنے ہی بڑے اور بزرگ کیوں نہ ہو جائیں مجھے چار پانچ سال کے لڑکے ہی نظر آتے ہیں"۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ یوں چاہے میں نے اقتدار احمد کو اس سے پہلے بھی دیکھا ہو گا لیکن وہ مجھے قطعی یاد نہیں البتہ ایک شام بھلائے نہیں بھولتی جب میں نے ضلع حصار مشرقی پنجاب انڈیا کے محلّہ جوتی پورہ میں ان کے بڑے بھائی اظہار احمد صاحب کے ساتھ اقتدار مرحوم کو دیکھا تھا۔ وہ اس وقت مشکل سے چار پانچ برس کے ہونگے۔ اظہار صاحب میٹرک کا امتحان دے چکے تھے اور میں یہ امتحان دینے والا تھا لیکن میٹرک پاس کرنے سے قبل ہی میں حصار میں شاعر کی حیثیت سے معروف ہو چکا تھا اور اظہار صاحب اس شام میری شاعری کے بارے میں کوئی بات کر رہے تھے کہ اقتدار نے بڑی معصومیت کے ساتھ مجھ سے مخاطب ہو کر کہا تھا "بھائی صاحب مجھے بھی تو بتائیں شاعری کیا ہوتی ہے"۔۔ ننھے اقتدار کے اس سوال کرنے سے پہلے بھی گفتگو کے دوران میں جب بھی اس پر میری نظر پڑتی وہ مجھے سوالیہ نشان ہی نظر آتے۔ یعنی مجھے بارہا خیال آ رہا تھا کہ اس لڑکے میں جستجو اور تلاش کا جذبہ کچھ زیادہ ہی دکھائی دے رہا ہے۔ اقتدار مرحوم کی بعد کی زندگی سے کم از کم مجھے اپنے اس اندازے کی تصدیق ہی ہوئی۔ عجیب اتفاق ہے' حالانکہ ضلع حصار محلّہ جوتی پورہ میں ہمارے گھر قریب قریب ہی تھے لیکن مجھے یاد نہیں کہ ڈاکٹر اسرار احمد کو میں نے وہاں کب دیکھا۔ ڈاکٹر اسرار صاحب سے میری پہلی ملاقات سرسہ ضلع حصار میں سبزی منڈی کے قریب ایک محلّہ میں ہوئی تھی جہاں ان کی بڑی ہمشیرہ اقبال مرحومہ کا گھر عین ہمارے گھر کے سامنے تھا اور ڈاکٹر صاحب وہاں آئے ہوئے تھے۔ اس وقت غالباً ڈاکٹر اسرار احمد گیارہ بارہ سال کی عمر سے زیادہ کے نہ ہونگے۔

ہاں تو میں عزیز مرحوم اقتدار احمد کا ذکر کر رہا تھا۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد غالباً ۴۹-۱۹۴۸ء میں ڈاکٹر اسرار صاحب سے تو میری ملاقات لاہور ریلوے اسٹیشن پر ہو گئی تھی۔ اس وقت اقتدار مرحوم سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ گویا چار پانچ سال کی عمر کے بعد اقتدار جب مجھ سے ملے تو شاید آپ یہ سن کر حیران ہونگے کہ اس وقت وہ انیس بیس سال کے نوجوان تھے۔ اس دوران میں یقیناً ہم کہیں نہ کہیں

> "جستجو اور لگن اقتدار کی شخصیت کا ایک خاص پہلو تھا لیکن عام آدمی کو جلدی سے اس کی خبر نہ ہوتی تھی کیونکہ اس جستجو اور لگن کے ساتھ ساتھ اقتدار صبر و استقلال کے بھی حامل تھے"

ضرور ملے ہوں گے' اور کہیں نہ سہی ساہیوال میں ڈاکٹر اسرار صاحب کے گھر پر ہماری ملاقات ہوئی ہو گی۔ ادھر یہ تمام بھائی اپنے بزرگوں کا اس قدر احترام کرتے ہیں کہ شاید ہی فی زمانہ اس کی مثال ہمیں کسی دوسرے گھرانے میں نظر آئے۔ دور جانے کی ضرورت نہیں یہ تمام بھائی ڈاکٹر اسرار صاحب سمیت خود میرا احترام اس قدر کرتے ہیں کہ اس قدر احترام اپنے کسی بزرگ کا کوئی کیا کرتا ہو گا۔ غالباً اسی وجہ سے کہ میں چونکہ ساہیوال میں ڈاکٹر اسرار صاحب سے ملنے کے لئے آتا تھا۔ اقتدار اپنے خورد ہونے کے باعث مجھ سے نہ ملتے ہونگے۔ بہرحال انیس بیس برس کا اقتدار مجھے ہیڈ بلوکی کے قریب بھائی پھیرو (اب پھول نگر) غالباً ۱۹۵۶ء میں ملنے کے لئے آیا۔

ویسے تو ہماری یہ ملاقات پہلے سے طے شدہ تھی لیکن تھی بڑی اہمیت کی حامل۔ ملاقات کا فیصلہ میرے اور ڈاکٹر اسرار صاحب کے درمیان ہوا تھا' میرے اور اقتدار کے درمیان نہیں۔ اقتدار تو مجھ سے ملنے کے لئے اس لئے آ رہے تھے کہ بڑے بھائی کا حکم تھا کہ لاہور سے منٹگمری (اب ساہیوال) آتے ہوئے راستے میں مجھ سے مل کر آئیں۔ ڈاکٹر اسرار صاحب نے مجھے پہلے سے بتا دیا تھا کہ آج کل ان حضرت یعنی اقتدار صاحب کو یہ دھن سوار ہے کہ یہ پتا لگایا جائے کہ موت کی اصل حقیقت کیا ہے؟۔ وہی جذبہ تلاش "Cuvionity" ذوق جستجو' جس کا اشارہ میں پہلے کر چکا ہوں' جو اقتدار کی شخصیت کا نمایاں پہلو تھا چنانچہ اب اقتدار میرے سامنے بیٹھے ہوئے تھے اور مجھے گفتگو کا آغاز اس طرح کرنا تھا کہ انہیں یہ بالکل معلوم نہ ہو سکے کہ ہماری یہ ملاقات پہلے سے طے شدہ ہے۔ لہٰذا میں نے گفتگو کا آغاز اپنے اسی تاثر سے کیا جو مجھ پر اقتدار کو چار پانچ سال کا دیکھ کر ہوا تھا۔ "اقتدار میاں میں نے جب آپ کو پہلی بار دیکھا تھا حالانکہ اس وقت آپ چار پانچ سال کی عمر سے زیادہ نہ ہوں گے آپ میں تجسس "Cuvionity" اور تلاش کا جذبہ نمایاں تھا"۔۔ "کہنے لگے' بھائی مشکور یہ جذبہ تو مجھ میں آج بھی پوری طرح موجود ہے۔۔اور.... اور"۔۔۔ میں نے کہا "بھائی اور . . . اور کیا کر رہے ہیں' آگے بھی تو بولئے" کہنے لگے "کیا عرض کروں آج کل میرے سر پر یہ بھوت سوار ہے کہ میں موت کی حقیقت کو معلوم کروں"۔۔۔۔ میں نے بھی ان کی اس بات پر ادھر ادھر کی گفتگو کر کے آخر میں ان سے یہ سوال کر ڈالا "کیا آپ نے زندگی کی حقیقت معلوم کر لی ہے جو

موت کی حقیقت معلوم کرنے کے درپے ہو رہے ہیں" وہ ایک دم خاموش ہو گئے --- میں نے اپنی بات کو آگے بڑھایا "دیکھو برادر عزیز جو لوگ زندگی کے حقائق معلوم کرنے میں سرگرم عمل رہتے ہیں انہیں موت کی حقیقت خود بخود معلوم ہو جاتی ہے۔ آپکے ہاتھ نہ موت آئے گی اور نہ زندگی۔ اس لئے میرے نوجوان بھائی! زندگی کے حقائق کا کھوج لگانا شروع کردو اس کے بعد نہ صرف موت کی حقیقت آپ کو معلوم ہو جائے گی بلکہ موت ایک زندگی کی صورت میں آپ کے سامنے ہاتھ باندھ کھڑی ہو گی"--- اقتدار مرحوم پر اس ملاقات کا اثر اچھا رہا۔ اس کا اظہار مجھ سے ڈاکٹر اسرار صاحب نے انہیں دنوں میں کیا تھا۔ اقتدار مرحوم بھی ہماری اس ملاقات کو بڑی "تشفی بخش" کہا کرتے تھے۔

جستجو اور لگن اقتدار کی شخصیت کا ایک خاص پہلو تھا لیکن عام ملاقات میں عام آدمی کو جلدی سے اس کی خبر نہ ہوتی تھی کیونکہ اس جستجو اور لگن کے ساتھ ساتھ اقتدار صبر و استقلال کے بھی حامل تھے۔ لگن اور حوصلہ اکٹھے ہو جائیں تو کردار میں ایک عجیب انداز کا بانکپن اور حسن و جمال پیدا ہو جاتا ہے' سو وہ اقتدار کے کردار میں موجود تھا۔ بظاہر دھیما آدمی اندر سے سعی و عمل کا ایک سیلاب رواں ..... جب اقتدار کے بیٹے اور داماد کا حادثہ پیش آیا تو میں تعزیت کے لئے ان کے پاس گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اپنے غم کو کچھ زیادہ ہی حوصلہ و ہمت کے ساتھ برداشت کرنے کی سعی میں مصروف ہیں۔ میں نے کہا "دیکھو میرے پیارے بھائی۔ کسی غم کو برداشت کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ اپنی فطرت کے تقاضوں کو فراموش کر دیں" ایک دم بولے "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟" میں نے جواب میں کہا "آپ کا دل رونے کو کر رہا ہے' ٹھیک ہے سب کے سامنے نہ روئیں لیکن الگ بیٹھ کر خوب روئیں --- ہم نے ایک حوالے سے رونے کو خود پر جو حرام کر لیا ہے' یہ تمام تر ہماری ناسمجھی ہے۔ البتہ کسی مرحوم پر محض رونا بھی کوئی معنی نہیں رکھتا۔ آدمی کی المیہ حس "Tragic Sense"

"یہ تمام بھائی اپنے بزرگوں کا اس قدر احترام کرتے ہیں کہ شاید ہی فی زمانہ اس کی مثال ہمیں کسی دوسرے گھرانے میں نظر آئے' یہ تمام بھائی ڈاکٹر اسرار احمد سمیت خود میرا احترام اس قدر کرتے ہیں کہ جیسے کوئی اپنے بزرگ کا کرتا ہے"

اس کے ذوق فکر و عمل کو کند نہیں کرتی بلکہ جلا بخشتی ہے"۔

یہ پھر ایک عجیب اتفاق ہے کہ جس طرح اقتدار سے میری بھرپور ملاقات غالباً ۱۹۵۶ء میں ہوئی تھی اسی طرح درمیان میں پھر کبھی نہیں ہوئی۔ ہاں جب وہ پندرہ روزہ "ندا" کے ایڈیٹر ہوئے' گویا ۸۷-۱۹۸۶ء میں ان سے دوبارہ بھرپور ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ گویا پورے بیس برس کے بعد --- "ندا" کے دور کی ملاقاتیں یادگار ملاقاتیں ہیں۔ ان ملاقاتوں سے مجھے پہلی حیرت تو یہی ہوئی جس کا ذکر بیشتر اہل قلم احباب نے کیا ہے کہ کاروباری آدمی ہونے کے باوصف اقتدار کو شعر و ادب سے نہ صرف ذوق تھا بلکہ وہ نثر بھی لکھنے کی بڑی استعداد رکھتے تھے اور انہوں نے "ندا" اور "ندائے خلافت" دونوں جریدوں میں مختلف انداز سے اپنی اس صلاحیت کا بخوبی اظہار کیا ہے اور شاید آپ یہ سن کر حیران ہوں کہ اقتدار شاعری بھی کر سکتے تھے۔ اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب انہوں نے مجھے ضیاء الحق کے آخری دور میں طنزیہ اور مزاحیہ نظمیں لکھنے کے لئے کہا۔ اقتدار نے میری طنزیہ نظموں کا مجموعہ "نوئی نظمیں" پڑھ رکھا تھا۔ یہ نظمیں ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۵ء تک کے زمانے میں لکھی گئی تھیں لیکن بقول ناقدین ہم آج تک اسی طرح کے حالات سے دوچار ہیں۔ یعنی ان نظموں میں آج کی صداقت بھی موجود ہے۔ بہرحال میں نے طنزیہ نظمیں کسی خاص شخصیت کو سامنے رکھ کر نہیں لکھی تھیں اپنے اردگرد کے حالات کے مشاہدہ نے مجھ سے یہ نظمیں لکھوائی تھیں۔ میں اپنی ان نظموں کو بڑی شاعری بھی نہیں گردانتا اسی لئے ان میں سے اکثر نظمیں ایک ہی نشست میں بیٹھ کر فی البدیہہ لکھی ہوئی ہیں۔ اقتدار نے پوچھا "تو پھر بھائی صاحب آپ ندا کے لئے طنزیہ نظمیں لکھیں گے نا۔ دیکھ لیجئے"--- میں نے جواب دیا "عزیز محترم مجھے پاکستان کی کسی سیاسی جماعت' گروہ یا پارٹی سے ذاتی وابستگی نہیں' میں تو اپنے سیاست دانوں کے غلط رویوں سے بیزار ہوں۔ اہل سیاست صحیح راہ پر گامزن ہوں تو قوم کسی طرح بھی نہیں بھٹک سکتی"-- یوں ضیاء الحق کے آخری دور میں بھی میں نے اپنی استعداد کے مطابق ڈٹ کر نظمیں کہیں اور وہ "ندا" میں چھپیں بھی۔ ویسے ان نظموں کی ایک ایک کاپی میں دوسرے جرائد کو بھی بھیجتا تھا لیکن دوسرے جرائد میں انہیں چھاپنے کی ہمت نہ تھی' ایک دو روزناموں کو چھوڑ کر مثلاً "امن" کراچی وغیرہ۔ ہاں تو مجھے ان نظموں کو لکھنے کے دور میں پتہ چلا کہ اقتدار کو نہ صرف شعر فہمی کا شعور ہے بلکہ اگر وہ چاہیں تو خود بھی اچھی خاصی شاعری کر سکتے ہیں۔

ویسے دینی معاملات میں وہ اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے نقش قدم پر چلتے تھے۔ میں ڈاکٹر صاحب سے اور اقتدار سلمہ دونوں سے اکثر کہتا رہتا تھا اور کہتا رہتا ہوں کہ مسلم امہ میں نفاق اور عدم اتفاق کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمیں جو کچھ ہمارے بزرگ عموماً جاہل بزرگ بچپن اور لڑکپن میں غلط باتیں بتا دیتے ہیں ہم ان پر سختی سے ایمان لے آتے ہیں۔ پھر بات وہیں ختم نہیں ہو جاتی' اپنی ان باتوں پر اپنے ادھورے علم کا ملمع بھی چڑھانے کی سعی کرتے ہیں۔ یعنی وہی بات جو میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ آدمی سمجھتا زیادہ ہے اور سوچتا کم ہے۔ اور پھر سب سے زیادہ قیامت برپا ہونے کی بات یہ ہے کہ وہ یعنی آدمی اپنے اس غلط سمجھنے پر ڈٹ بھی جاتا ہے یعنی اپنی غلط فہمی کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیتا ہے۔ حالانکہ ہونا تو یہ چاہئے کہ ہم سوچ کر کسی بات کو سمجھا کریں لیکن عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ ہم پہلے سمجھتے ہیں اور پھر سوچتے ہیں جس کی وجہ سے ہماری زندگی کا بیشتر حصہ غلط فہمیوں کا شکار رہتا ہے۔ ہمارے بیشتر تعصبات کی واحد وجہ بھی یہی ہے۔ ورنہ میں یہ بھی اکثر کہا کرتا ہوں کہ ہم مسلمانوں کو اللہ اور اس کے رسولؐ اور کتاب و سنت و آخرت پر اگر یقین ہو یعنی اگر ہم واقعی مسلمان ہوں تو فقہی اختلافات ہمارے لئے آپس کی عداوت اور دشمنی کا باعث نہیں بن سکتے۔ سارا جھگڑا ہمارا صحیح معنی میں مسلمان نہ ہونے کا ہے۔ اسی لئے میں نے اکثر ڈاکٹر اسرار صاحب سے یہ پوچھا ہے کہ آپ اپنے سامعین میں سے کتنے افراد کو اس معیار دین پر لانے میں کامیاب ہوئے ہیں کہ وہ دنیا پر آخرت کو ترجیح دینے لگے ہوں" اور ڈاکٹر صاحب نے جواب میں مجھے ہمیشہ یہی فرمایا ہے "مشکور بھائی یہی تو ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ہے"۔

اقتدار کے صاحب دین ہونے کے بارے میں اکثر اہل قلم نے لکھا ہے لیکن میرا مشاہدہ یہ ہے کہ جس طرح اقتدار دین پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہنا

چاہتے تھے اسی طرح مضبوطی کے ساتھ انہوں نے دنیا کو بھی اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ میں اقتدار کی اس صورتحال سے بڑی حد تک مطمئن تھا کہ دنیا کو اپنی گرفت میں لینا کافی حد تک انسان کے اپنے سعی و عمل کے بس میں ہوتا ہے جبکہ دین کو مضبوطی کے ساتھ پکڑنے میں پیشوائے دین کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ میں نے علماء کے بجائے پیشوا کا لفظ یہاں خصوصیت کے ساتھ اس لئے استعمال کیا ہے کہ عموماً لوگوں کی رسائی علماء تک کم ہوتی ہے' اس لئے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ہم لوگ اپنے آس پاس کی کسی بھی دین دار شخصیت کو اپنا مذہبی پیشوا مان لیتے ہیں اور پھر آنکھیں بند کر کے یعنی اس پر اعتبار کر کے اس کی ہر بات پر "آمنا و صدقنا" کہتے چلے جاتے ہیں۔

ایک دن دوران گفتگو مجھ سے کہنے لگے "ایک سوال پوچھوں آپ کو جانے کی جلدی تو نہیں ہے"۔

میں نے کہا "کوئی جلدی نہیں آپ سوال پوچھئے"۔

کہنے لگے "بھائی صاحب یہ کیا بات ہے شیعہ لوگ حضرت علیؓ کو آنحضرتؐ کے بعد سب مسلمانوں پر فضیلت دیتے ہیں؟"۔

میں نے کہا "شکر ہے آپ نے آنحضرتؐ کے بعد کہا ہے ورنہ..." میں ابھی اپنا جملہ پورا نہ کرنے پایا تھا کہ اقتدار بولے "ایسی بات نہیں ہے میں نے اس ضمن میں خاصی تحقیق کی ہے۔ یہ جو اکثر اوقات ہم لوگوں ہی میں سے زیادہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ شیعہ حضرت علیؓ کو معاذ اللہ آنحضرتؐ سے بھی افضل سمجھتے ہیں یہ بالکل شیعہ پر بہتان ہے۔ جاہل لوگوں کی الگ بات ہے۔ میں نے کسی پڑھے لکھے شیعہ کو ایسی بات کہتے نہیں سنا"۔

"اقتدار میاں یہی تو قابل افسوس اور قابل توجہ بات ہے کہ چلئے ایک جاہل کوئی بات کہتا ہے تو آپ اسے کسی حد تک معاف کر سکتے ہیں لیکن مشکل تو یہ آن پڑی ہے کہ غیر شیعہ حضرات میں سے پڑھے لکھے افراد ایسی باتیں کرتے ہیں جن کا کوئی سرپاؤں نہیں ہوتا یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ یہ پڑھے لکھے ہونے کے باوجود ایسی بات کر جاتے ہیں جن پر اگر یہ خود ٹھنڈے دل سے غور کریں تو ان پر بہت کچھ حقیقت خود بخود واضح ہو جائے"۔ "مثلاً؟" اقتدار نے سوالیہ انداز میں کہا۔ میں نے کہا "مثال کے طور پر ابھی ابھی جو سوال آپ نے کیا ہے کہ شیعہ حضرات بعد رسولؐ حضرت علیؓ کی فضیلت کا کچھ زیادہ یا بہت زیادہ پرچار کرتے ہیں اس کی وجہ کیا ہے؟۔ تو میرے عزیز بھائی اس سوال کا جواب بہت ہی سیدھا سادا سا ہے اور اسی وجہ سے یعنی اپنی سادگی کی وجہ سے یہ سوال بہت معقول بھی ہے۔ اور غالباً اسی سبب سے شیعہ حضرات پر ہی موقوف نہیں ہر ذی شعور مسلمان علیؓ کی فضیلت کا قائل ہے۔ "وہ کیسے؟" اقتدار نے اپنے ذوق تجسس کے تحت میری بات کاٹ کر مجھ سے پوچھا۔ میں نے کہا "وہی تو جواب دے رہا ہوں۔ لیکن غور سے سنئے"۔ اقتدار نے پھر لقمہ دیا "ایک طرف تو بھائی صاحب! آپ اپنی بات کو سیدھی سادی بات بتا رہے ہیں دوسری طرف مجھے غور سے سننے کی تاکید کئے جا رہے ہیں۔ یہ کیا بات ہوئی؟" "جی ہاں عزیز من ہم لوگ سیدھی باتوں پر ہی توجہ نہیں دیتے جس کی وجہ سے ہم اپنے آپ کو جہالت کے بہت بڑے دلدل میں پھنسا لیتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں ٹیڑھی بات کی نسبت سیدھی بات کو سمجھنے کے لئے زیادہ توجہ کی ضرورت ہے"۔

"فرمایئے" اقتدار مزید متوجہ ہو کر بولے۔ میں نے اپنی بات اس طرح شروع کر دی "اس تاریخی حقیقت کو تو آپ تسلیم کرتے ہیں کہ جناب ابوطالب کی معاشی حالت کے باعث ان کی اولاد کی پرورش کا ذمہ ان کے بھائیوں نے لے لیا تھا اور حضرت علیؓ آنحضرتؐ کے حصہ میں آئے تھے۔ ایک روایت کے مطابق پیدا ہونے کے بعد حضرت علیؓ نے آنحضرتؐ کی آغوش ہی میں آنکھیں کھولی تھیں۔ گویا حضرت علیؓ کو بچپن سے لے کر آنحضرتؐ کے آخیر زندگی تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تربیت حاصل کرنے کا موقع دیگر حضرات کی نسبت سب سے زیادہ میسر آیا۔ دوسری طرف اس حقیقت سے بھی تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ حضرت علی فطرتاً ذہین تھے اور طبع رسا کے مالک بھی یعنی اچھی باتوں کو اپنے میں جذب کرنے کی صلاحیت بھی ان میں بدرجہ اتم موجود تھی"۔

"یہ باتیں میں بھی مانتا ہوں"۔

تو پھر اب خدا کے لئے آپ ہی فرمایئے تربیت دینے والے آخری رسول ہوں اور تربیت حاصل کرنے والا بچہ علی جیسا ہو تو ایسے بچہ کے فاضل اور افضل ہونے میں کونسا امر مانع ہو سکتا ہے۔ گویا حضرت علیؓ کی تمام تر فضیلتوں کا باعث آنحضرتؐ کی ذات گرامی کا انداز تربیت اور علیؓ کی ذات کا جاذب اور ذہین و فطین ہونا ہے"۔

"ذرا ٹھہریئے بھائی مشکور صاحب! شیعہ حضرات تو اپنے آئمہ کو معصوم عن الخطا اور مامور من اللہ بھی تو مانتے ہیں۔ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

"تھوڑی سی توجہ دی جائے تو اس سوال کا جواب بھی ہمیں اسی حقیقت سے حاصل ہو سکتا ہے کہ یہ سب کچھ تعلیم و تربیت رسولؐ ہی کا نتیجہ ہے... علیؓ کو رسولؐ نے تربیت دی۔ صرف اتنا نہیں حضورؐ کو امام حسنؓ اور امام حسینؓ کو بھی کچھ عرصہ تربیت دینے کا موقع میسر آیا۔ اس کے بعد ہر امام نے تربیت رسولؐ کو اپنی تمام زندگی میں شامل حال رکھا اور یوں وہ خطاؤں سے بچتے رہے اور مامور من اللہ بھی ہوئے کہ یہ تمام مواقع بہم پہنچانے والی خدا کی ذات ہے۔ اگر کوئی اتنی صاف اور واضح بات کو یہ سمجھے کہ شیعہ معاذ اللہ امام کو نبی کا درجہ دیتے ہیں' یہ ناسمجھی نہیں تو اور کیا ہے۔ دراصل اس طرح کی ناسمجھی پھیلانے والے لوگ ہی مسلم امہ کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کا باعث ہوتے ہیں"۔

> **"مجھے یوں لگا جیسے زندگی کے اسرار و رموز کی کھوج لگانے والا شخص موت کی کھوج لگانے کیلئے نکل گیا' مجھے پوری پوری امید ہے کہ وہاں ان شاء اللہ موت نہیں زندگی ہی اس کا استقبال کرتی ہوئی اسے ملے گی"**

اقتدار کہنے لگے "بھائی صاحب واقعی یہ سب باتیں بہت غور طلب ہیں پھر بھی میں بھائی صاحب یعنی ڈاکٹر اسرار صاحب سے ضرور پوچھوں گا"۔

میں نے کہا "ضرور پوچھئے" اتنے میں اقتدار نے سگریٹ سلگائی اور میں نے پھر بزعم خویش بڑے محکم انداز میں انہیں سگریٹ پینے سے روکا۔ سگریٹ چھوڑنے کے بارے میں اقتدار سے میں نے ایک بار نہیں کئی بار کہا اور وہ جواباً ہمیشہ مسکرا دیتے' جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ وہ سگریٹ نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ ایک دن میں نے جھنجلا کر کہا۔

"آپ کو معلوم ہے سگریٹ موت کا پروانہ بھی بن سکتی ہے"۔

مسکراتے ہوئے انہوں نے غالبا کا یہ مصرعہ پڑھ دیا۔

"موت کا ایک دن معین ہے"۔

"جی ہاں موت کا ایک دن معین ضرور ہے لیکن ان معنی میں نہیں جس میں عام لوگ سمجھتے ہیں اور جس معنی کے تحت آپ نے یہ مصرع پڑھا ہے"۔

"موت پھر کس طرح معین ہے؟" اقتدار نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے سوالیہ نشان بلکہ جستجو کا سراپا بن کر دیکھا --- اور یہ سوال اٹھایا --- میں نے جواب دیتے ہوئے کہا "دیکھو میرے بھائی موت کا ایک دن معین ہونے کا یہ مطلب ہرگز ہرگز نہیں ہے کہ کوئی خاص دن یا وقت موت کے لئے مختص کر دیا گیا ہے۔ بلکہ اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ آدمی کو مرنا لازم ہے' اسے ایک نہ ایک دن موت ضرور آنی ہے --- کب آنی ہے؟ یہ امر Fixed نہیں ہے۔ آپ اپنی زندگی کو چھوٹا اور بڑا کر سکتے ہیں' یہ آپ کے اختیار میں ہے اور میں جو آپکو سگریٹ پینے سے منع کرتا ہوں آپ کے اسی اختیار کے تحت منع کرتا ہوں کہ آپ خواہ مخواہ اپنی موت کو اپنے سے قریب نہ کریں۔ یاد رکھئے غالب کے شعر کا مفہوم بھی یہی ہے جو میں نے بیان کیا ہے۔ وہ مفہوم ہرگز نہیں جو عام لوگ سمجھتے ہیں۔ بھلا سوچئے تو سہی کل یوم ھو فی شان والی دنیا میں کوئی شے احکامات سے تو بھرپور ہو سکتی ہے

> **"میں اپنی طنزیہ نظموں کی ایک ایک کاپی "ندا" کے علاوہ دوسرے جرائد کو بھی بھیجتا تھا لیکن دوسرے جرائد میں انہیں چھاپنے کی ہمت نہ تھی"**

مقید اور معین کس طرح ہو سکتی ہے۔ البتہ آپ ہر شے کو مقدر ضرور کہہ سکتے ہیں"۔

"مطلب یہ ہے کہ اب میں آپ سے یہ پوچھوں کہ تقدیر کے کیا معنی ہیں؟"

"مختصراً اس کا جواب یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے ایک اندازہ سے بنائی گئی ہے لیکن یہ اندازہ (static) جامد نہیں ہے۔ امکانات سے بھرپور ہونے کے باعث (dynamic) محرک اور فعال ہے۔ یعنی (definit) نہیں (indefinit) ہے اور اسی وجہ سے فنا پذیر بھی ہے"۔ indefinit ہونا کثرت سے ہوتا ہے اور سورۂ کوثر کی پہلی آیت کا بھی یہی مفہوم ہے۔ اگر آپ اس سیاق و سباق کے ساتھ اس پر غور فرمائیں"۔ آنکھوں میں چمک لا کر بولے "بھائی مشکور صاحب آپ کی باتوں پر بہت غور کرنے کی ضرورت ہے اور اسی کی کم از کم آج کل میرے پاس فرصت نہیں ہے"۔

ڈاکٹر اسرار صاحب کی وجہ سے ماشاء اللہ ان کا اور ان کے تمام بھائیوں کے گھروں کا ماحول اسلامی اقدار پر قائم ہے۔ میں نے اپنے منجھلے بیٹے کی دعوت ولیمہ پر حسب معمول ڈاکٹر صاحب کو اور اقتدار مرحوم کو مدعو کیا تو ڈاکٹر صاحب غالباً اپنی علالت کے باعث نہ آ سکے۔ اپنی جگہ اپنے بیٹے عارف سلمہ کو بھیج دیا اور اقتدار مرحوم بہ نفس نفیس دعوت ولیمہ میں شریک ہوئے لیکن جیسے ہی ہمارے برخوردار اپنی دلہن کے ہمراہ ہال میں داخل ہوئے اور ہماری توقع کے خلاف ان کے سسرال والوں کی طرف سے فلم بنانے والے نے تصویر لینے کے لئے تیز روشنی دلہا دلہن پر ڈالی' اقتدار مرحوم لاحول پڑھتے ہوئے کھانا کھائے بغیر ہال سے باہر چلے گئے۔ مجھے ان کے جانے پر نہ کوئی حیرت ہوئی اور نہ افسوس' کیونکہ میں ان کا یہ اقدام حق بجانب سمجھتا تھا۔ جب ایک ہفتہ بعد ان سے ملاقات ہوئی اور میں نے کوئی شکایت نہیں کی تو وہ خود ہی بولے "مشکور بھائی مجھے آپ کی یہ ادا بہت بھاتی ہے کہ آپ اپنی غلطی تسلیم کرنے میں ذرا دیر نہیں لگاتے"۔ میں نے کہا "میری جان کاش ہم سب میں یہ بات پیدا ہو جائے"۔

جب "ندا" کا دفتر سمن آباد میں تھا۔ اقتدار سے میری ملاقات قریب قریب ہر دوسرے روز ہو جایا کرتی تھی لیکن جب یہ دفتر ماڈل ٹاؤن میں منتقل ہوا تو اقتدار سے میرا ملنا برائے نام رہ گیا۔ ایک روز میں ماڈل ٹاؤن والے دفتر میں بیٹھا تھا کہ اقتدار نے نہایت محبت کے ساتھ مجھے کہا "بھائی صاحب آپ نے اپنے چھوٹے بھائی کا گھر آج تک نہیں دیکھا" میں نے فوراً کہا "بھائی تو آج ہی دکھا دیجئے"۔ اقتدار فوراً اپنی پجیرو میں بٹھا کر مجھے اپنے گھر لے گئے۔ اپنے تمام پوتے پوتیوں اور حاضر نواسے نواسیوں سے ملایا۔ گھر ماشاء اللہ بہت وسیع و عریض تھا۔ مجھے پھر خیال آیا کہ دین کے ساتھ دنیا پر اقتدار کی گرفت کتنی ہے اور اس گرفت کا انضباط کس قدر گہرا اور وسیع ہے۔

اقتدار کی رحلت سے کچھ عرصہ پہلے میں نے ڈاکٹر اسرار صاحب سے ملنے کے لئے ماڈل ٹاؤن فون کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے جواباً فرمایا "ابھی آ جایئے میں گھر پر ہی موجود ہوں" --- میں ماڈل ٹاؤن کے لئے روانہ ہو گیا۔ خیال تھا کہ ڈاکٹر اسرار صاحب کے ساتھ ہی اقتدار صاحب سے بھی ملاقات ہو جائے گی لیکن جیسے ہی میں ماڈل ٹاؤن میں داخل ہوا اقتدار سامنے سے آتے ہوئے نظر آئے' گاڑی روک کر کہنے لگے "بھائی صاحب میں تو ذرا کاروبار کے ضمن میں دفتر جا رہا ہوں۔ آپ ڈاکٹر صاحب سے ضرور ملئے اور وہ بات بھی کیجئے"۔ میں نے کہا "وہی بات کرنے جا رہا ہوں"۔ فون پر میں نے اقتدار سے کہا تھا کہ اس وقت ہمارے دینی علماء کو اپنے تمام تر تعصبات کو ختم کر کے کھلے دل سے مسلم امہ کے اتحاد کی طرف توجہ دینا چاہئے اور میں ڈاکٹر اسرار صاحب سے ملاقات پر یہی باتیں کیں۔ ہمارے اکثر علماء دین اوپر سے اتحاد کی بات پر ہاں ہاں کر دیتے ہیں لیکن اپنے دلوں سے وہ بے کار اور بے معنی تعصبات کو نہیں نکالتے۔ یہ مسلم امہ کی ہمیشہ سے سب سے بڑی بدقسمتی رہی ہے۔ میری سمجھ میں تو یہ بات کسی طرح نہیں آتی کہ اللہ اور اس کے رسولؐ پر واقعی ایمان رکھنے والا شخص تنگ نظر اور متعصب کس طرح ہو سکتا ہے"۔

ایک صبح عاکف سلمہ کا فون آیا۔ "سر! اچھی خبر نہیں ہے اقتدار چچا کا انتقال ہو گیا ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے زندگی کے اسرار و رموز کی کھوج لگانے والا شخص موت کی کھوج لگانے کے لئے نکل گیا۔ لیکن مجھے پوری پوری امید ہے کہ وہاں ان شاء اللہ موت نہیں زندگی ہی اس کا استقبال کرتی ہوئی اسے ملے گی۔ اور وہ مجھے یاد کرتے ہوئے کہے گا "بھائی مشکور سچ ہی تو کہتے تھے زندگی کی کھوج میں لگ جاؤ موت کے اسرار خود بخود زندگی بن کر سامنے آتے چلے جاتے ہیں"۔

☆ ☆ ☆

رفقاء و احباب مطلع رہیں کہ ان شاء اللہ العزیز

تنظیم اسلامی کا

بیسواں سالانہ اجتماع

جمعۃ المبارک ۲۰/ اکتوبر تا اتوار ۲۲/ اکتوبر ۹۵ء

بمقام مینار پاکستان منعقد ہو گا!

اسی موقع پر

احیاءِ خلافت کانفرنس

کا انعقاد بھی کیا جائے گا!

محترم المقام جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب
السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

ہفت روزہ "ندائے خلافت" کی اشاعت خصوصی برسانحہ ارتحال مدیر "ندائے خلافت" جناب اقتدار احمد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے حوالے سے یہ چند سطور جو میری قلم سے نکلی ہیں' اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنے ایک دوست کے ذریعے جو تنظیم اسلامی سے منسلک ہیں' ہفت روزہ "ندائے خلافت" اکثر میرے زیر مطالعہ رہتا تھا۔ چنانچہ مدیر "ندائے خلافت" کی وفات پر اپنے تاثرات پیش کر رہا ہوں۔

بانی و مدیر ہفت روزہ "ندائے خلافت" نہ صرف ایک بلند پایہ صحافی اور صاحب طرز ادیب تھے بلکہ وہ "تحریک خلافت" کے ایک نڈر اور بے باک سپاہی بھی تھے۔ انہوں نے شرح صدر کے ساتھ یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ امیر تنظیم اسلامی اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے جس راستے پر گامزن ہیں' وہی سیدھا راستہ ہے اور مشیت ایزدی نے ان کو اس مقصد عظیم کے لئے چن لیا ہے' اپنی تمام تر صلاحیتوں' ذہانتوں اور تمام مالی وسائل بلکہ پوری زندگی کو اس کار خیر کے لئے وقف کر ڈالا۔ نیز کاروباری زندگی میں جو پیسہ اپنی انتھک محنت اور مشقت کے ساتھ کمایا تھا' وہ امیر تنظیم اسلامی کے قدموں میں لا کر ڈھیر کر دیا۔ سب سے پہلے ایک لاکھ روپے کا عطیہ دیا جو اس وقت کے لحاظ سے بہت بڑا تعاون تھا۔ عام طور پر دیکھا جائے تو بھائی تو بھائی کا "شریک" ہوتا ہے اور اگر حقیقی اور صاف لفظ استعمال کیا جائے تو اگر حاسد نہیں تو کم از کم اس کا دل اپنے بھائی کے متعلق پوری طرح شفاف تو اکثر نہیں ہوتا۔ لیکن مدیر ہفت روزہ "ندائے خلافت" نے اپنے بھائی کے ہاتھ پر بیعت کر کے ایسی مثال پیش کی جس کی مثال قرون اولیٰ کے مسلمانوں میں تو مل سکتی ہے مگر اس زمانے میں شاید ہی کہیں ملے۔ اور پھر اپنے بھائی کے لئے ایثار و قربانی کی وہ مثالیں قائم کیں کہ لوگ پکار اٹھے

ع ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی

کوئی ایسا بھائی سامنے آئے جس نے ایسی مثال قائم کی ہو جو آپ کے مرحوم بھائی نے آپ کے کرشن نگر والے مکان کی فروخت کے سلسلے میں پیش کی۔ یعنی بھائی کہ چھ لاکھ کی کمیٹڈ رقم ادا کر دی اور مشتری کی طرف سے کم قیمت کی رجسٹری کروانے کے مطالبہ کو پورا کرنے کے لئے اپنی گرہ سے رجسٹریشن فیس مبلغ چالیس ہزار روپے ادا کر دی۔

ان کی وفات پر مشاہیر اور متعدد دانشوروں' ادیبوں اور صحافیوں کے جو پیغامات موصول ہوئے ہیں' ان سے پتہ چلتا ہے کہ اگرچہ مرحوم نمود و نمائش کے قائل نہ تھے مگر تھوڑے ہی عرصے میں وہ اتنا کام کر گئے کہ لوگ حیران و ششدر رہ گئے۔ یہاں تک کہ ان سے اختلاف رکھنے والے رفقاء کو بھی ان کی وفات کی خبر سن کر یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے "ان کے جسم کا کوئی حصہ ان سے الگ ہو گیا ہے"۔ راقم مجیب الرحمٰن شامی کے تعزیتی پیغام کے یہ الفاظ "وہ دیانت دار' دوسروں کے کام آنے والے اور اللہ سے ڈرنے والے شخص تھے۔ ان کی راتیں اس کی یاد سے مہکتیں اور دن اس کے ذکر سے روشن تر تھے"۔ دہرا کر دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ عالم برزخ میں ان کے درجات بلند فرمائے اور قیامت کے روز جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے لئے بازوئے شفاعت پھیلائیں تو ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب حاصل ہو۔ آمین ثم آمین۔

دعا گو

(چودھری) فضل حق' لاہور

برادرم حافظ عاکف صاحب
السلام علیکم!

بزرگوارم! اقتدار احمد صاحب مرحوم کی تعزیت کی حاضری کے وقت آپ سے کہہ کر گیا تھا کہ چند الفاظ آپ کو لکھ کر بھیجوں گا مگر وقت نہ ملنے کے باعث دیر ہو گئی۔ آج آپ کی زیرادارت ہفت روزہ "ندائے خلافت" کا ۸ اگست کا شمارہ ملا تو یادیں تازہ ہو گئیں۔

بلاشبہ رسالے میں اقتدار احمد مرحوم کی جاندار تحریروں کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ ان کا اشہب قلم جس طرح فراٹے بھرتا تھا وہ اپنی مثال آپ تھا۔ وہ جتنی عرق ریزی اور گہرائی سے مضامین لکھتے تھے' اب ایسا لکھنے والا شاید ہی کوئی ہو گا۔ اشعار کے خوبصورت استعمال سے تراشیدہ نثر دل میں اترتی چلی جاتی تھی۔ اردو کے صف اول کے شعراء کے کلام میں ڈھلی ہوئی نثری خوبصورتیوں پر دل جھوم جھوم جاتا تھا۔

مگر اشعار ضرب الامثال اور محاوروں کا کہیں بھی ایسا استعمال دکھائی نہ دیتا تھا جو طبیعت پر بوجھ ہو۔ مگر نثر کے صوری حسن کی تخلیق کرتے وقت وہ مطالب و مفاہیم سے کہیں دغا کرتے دکھائی نہ دیتے تھے۔ ان کی تحریر کا تیسرا حسن یہ تھا کہ اس کی گہرائی میں پر جوش جذبہ بھی کار فرما رہتا تھا۔ دردمند دل کی پکار اس میں دھڑکتی رہتی تھی۔

۸ اگست کے اسی شمارے میں ۱۱اگست کے حوالے سے جو دلگداز تحریر شامل ہے وہ اچھوتی تحریر ہے جس میں انہوں نے قیام پاکستان کے فوراً بعد ہونے والی چھینا جھپٹی اور مہاجر کیمپوں میں ہونے والی زیادتیوں کی جھلک دکھلائی ہے۔ پورا مضمون ان کے طرز نگارش کا خوبصورت نمونہ ہے۔ ان کا ہر اداریہ اور مضمون ان کی علمی استعداد اور تخلیقی انداز کی تصویر کشی کرتا تھا۔

آپ نے درست لکھا ہے کہ اگر قارئین "ندائے خلافت" کے سابقہ معیار کو ذہن میں رکھ کر اس کا مطالعہ کریں گے تو انہیں مایوسی ہو گی۔ بلاشبہ یہ بات کہہ کر آپ نے اس خلا کے نہ پورا ہونے کا احساس ابھارا ہے جو مرحوم اقتدار احمد کے رخصت ہو جانے سے پیدا ہوا ہے۔ مگر آپ کے اندر سچائی' زندگی کے بنیادی مقاصد کو سمجھنے اور اس کے جواہر بکھیرنے کی جو صلاحیت ہے اس سے توقع کی جا سکتی ہے کہ آپ اپنی طرف سے اقتدار احمد مرحوم کی یاد کو محو کرنے کی کوشش میں کسی نہ کسی حد تک کامیاب ہوں گے۔

ہفت روزہ چٹان لاہور مرحوم شورش کاشمیری کی زندگی تک ان کی پر مغز اور دلکش تحریروں کا مرقع رہا۔ ان کی بھاری بھرکم شخصیت کا خلا پر کرنا گویا جوئے شیر لانے مترادف تھا۔ عزیزی مسعود شورش کی چٹان کو زندہ رکھنے کی کوششوں کو سلام پیش کرتا ہوں اور "مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا" کے مصداق وہ چٹان کو زندہ رکھنے میں کامیاب ہیں۔ مگر ناخدا کی کمی پوری نہیں ہو سکتی۔

"ندائے خلافت" حق و صداقت کا ترجمان جریدہ ہے جس میں آپ اور آپ کے بزرگ پوری ایمانداری سے سچائیاں بیان کرتے جا رہے ہیں۔ اور جو سلسلہ ہفت روزہ "ندا" کے اجراء سے شروع ہوا تھا وہ "ندائے خلافت" میں بھی جاگزیں دکھائی دیتا ہے۔ محنت شاقہ' کامل توجہ اور یکسوئی سے آپ جریدے کے معیار کو عزت مندانہ مقام پر فائز رکھ سکتے ہیں اور یوں اپنے چچا اور خسر جناب اقتدار احمد کی روح کو تسکین فراہم کر سکتے ہیں۔ خدا تعالیٰ انہیں جنت کے اعلیٰ مدارج سے سرفراز فرمائے اور آپ کو اور آپ کے عظیم والد کو سچائی کے مشن پر استقامت سے گامزن رکھے۔

آپ کا بھائی

طارق فاروق

جناب محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب دامت برکاتہم
السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

مجھے گھر سے ایک خط موصول ہوا تو اس میں برادر محترم اقتدار احمد صاحب کی وفات کی خبر تھی' بعد میں "ندائے خلافت" کے ذریعہ بھی آگاہی ہوئی اور انتہائی ذہنی اور قلبی تکلیف سے دوچار ہونا پڑا۔ کچھ عرصہ پہلے ہی ان کی طرف سے جو سوال پوچھا گیا تھا کہ میں "لکھوں یا نہ لکھوں" تو اس کے جوابات جو پورے ملک اور بیرون ملک سے جس طرح آئے تھے ان سے ان کی قلمی مقبولیت کا اندازہ ہوتا تھا۔

مرحوم انتہائی ملنسار' خاموش طبع اور شفیق انسان تھے۔ میرے اوپر ان کے کئی ایک بھاری بھرکم ذاتی احسانات تھے جنہیں میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ میں اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ ع اک غمگسار تھا' نہ رہا۔

میں نے آپ کی دعاؤں سے یہاں البانیہ میں جو ایک چھوٹا سا مدرسہ کھولا ہے جس میں تقریباً ۲۵ طلبا قرآن مجید حفظ کر رہے ہیں' ان سے مرحوم کے لئے مغفرت کی دعا کروائی ہے۔ آپ کے لئے یہ ذاتی اور تنظیم کے لئے اجتماعی طور پر ایک عظیم صدمہ اور نقصان ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صبر کرنے پر اجر عظیم عطا فرمائے اور اقتدار صاحب کی کمی کو پورا فرمائے۔

میری طرف سے اقتدار صاحب کے گھر والوں کو اظہار تعزیت اور جملہ احباب کو سلام قبول ہو۔

والسلام مع الاکرام
حافظ غلام شبیر البانیہ

بقیہ : رُوبرُو

نظریات و افکار کی دنیا میں مقابلہ کرنا ہوگا۔ علامہ اقبال نے بڑا وقیع کام کیا ہے اور اس کے مختلف شعبوں میں کام جاری رہنا چاہئے لیکن یہ کہ اس کو روک دیں تو یہ بھی غلط اور یہ بھی غلط کہ پہلے یہ کام کرلیں انقلابی جد و جہد بعد میں ہوتی رہے گی۔ یہ تو اس جد و جہد کے دو شعبے ہیں۔

* آپ نے شادی کے رسوم و رواج کی اصلاح پر بڑا زور دیا ہے اسلام علاقائی رسم و رواج کو کس حد تک برداشت کرتا ہے؟

● علاقائی ثقافت کو اسلام بہت برداشت کرتا ہے سوائے اس کے کہ وہ شے اسلام کے خلاف ہو۔ لیکن شادی بیاہ کا معاملہ علاقائی ثقافت کا نہیں ہے۔ اس میں کچھ چیزیں ہیں جو ہندوانہ رسم و رواج سے آئی ہیں۔ مثلاً جہیز کا قانون اسلام کے قانون وراثت کی ضد ہے۔ اسلام میں وراثت میں بیٹی کا حصہ ہے' ہندو مذہب میں نہیں ہے۔ یہ ان کے ہاں ہے کہ رخصت کرتے وقت جو دے دیا سو دے دیا۔ یہ محض ثقافت نہیں۔ اس کے پیچھے پورا قانونی فکری نظام ہے۔ یا پھر ہماری ثقافت مغرب سے آتی ہے۔ مقامی ثقافت کہاں ہے؟

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود

* خواتین کی حیثیت کو مناسب سطح پر لانے اور ان کے باپردہ ہونے پر آپ نے بہت زور دیا ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے دینی طبقات عورتوں کے ان جائز حقوق کی زیادہ بات نہیں کرتے جو اسلام نے انہیں دیئے ہیں (مثلاً وراثت میں حصہ) یہ چیز خواتین اور علماء میں دوری کا باعث بنتی ہے آپ کے خیال میں کیا یہ کمی ہے؟

● میرا خیال ہے آپ کی بات صحیح ہے۔ یہ بات میں نے کہی ہے لیکن ہو سکتا ہے میرے ہاں بھی اس بات پر اتنی توجہ نہ دی گئی ہو جتنی دینی چاہئے۔ لیکن بات درست ہے' ہونا چاہئے۔ OO

(بشکریہ ماہنامہ "ارقم" سرگودھا' اگست ۹۵ء)

بقیہ : تجزیہ

دوسرے کے حلیف ہیں اور عوام کی بے بسی کو دونوں اپنے اقتدار کے دوام کے لئے استعمال کر رہے ہیں' ان کا موقف درست ثابت ہو جائے گا۔ حکومت کو اپنے عمل کے ذریعہ یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ وہ کراچی کے عوام کی مخالف نہیں بلکہ اس کی ہمدرد ہے۔ یہ، تب ہی ہوگا جب حکومت انتہائی دل سوزی کے ساتھ مہاجروں کے سیاسی' معاشی اور گزشتہ تین برسوں کے دوران پیدا ہونے والے معاشرتی مسائل کو حل کرے۔ اگر حکومت ایسا کرنے میں کامیاب ہو جائے تو ایم کیو ایم خود ہی بکھر کر رہ جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے حکومت کو اقتدار کے ساتھ ساتھ تمام وسائل بھی مہیا کر رکھے ہیں۔ اگر اس کے باوجود وہ ان سے فائدہ نہیں اٹھاتی تو یہ اس کی انتہائی محرومی ہوگی۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے حکمرانوں کو معاملات کا صحیح فہم عطا فرمائے اور حالات سے نبرد آزما ہونے کی توفیق عطا فرمائے' طاقت کے ذریعے نہیں بلکہ پیار و محبت کے ذریعہ۔ کیونکہ ..... "جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ" OO

بقیہ : مکتوب کراچی

ہو رہا ہے۔ اگرچہ پورا ملک اس کی لپیٹ میں ہے مگر کراچی اس کے خصوصی نشانے پر ہے۔

مذاکرات کا "ڈھونگ" جس انداز پر رچایا جا رہا ہے' پوری دنیا ہنستی ہوگی کہ یہ کون سی قوم ہے جو مل بیٹھنے کی تمیز سے بھی عاری ہے۔ معاملات کو درست کرنے کے لئے کم سے کم جتنی عقل کی ضرورت ہے اس سے بھی محروم ہے۔ امریکہ اور ویتنام لڑنے کے بعد ایک میز پر آگئے اور اب سارے گلے شکوے ختم کر کے سفارتی تعلقات قائم کر چکے ہیں۔ روس برسوں افغانستان سے لڑتا رہا ہے مگر اب وہ ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے ہیں۔

یہ مسلم قوم جو ایک خدا' ایک رسول اور ایک کتاب کو مانتی ہے۔ اس کتاب کے ایک ایک حرف کی حفاظت اپنا ایمان سمجھتی ہے مگر اسے "حکم" بنانے کے لئے تیار نہیں۔ اس کتاب کے نازل کرنے والے نے فرمایا ہے کہ "عدل کرو چاہے وہ تمہارے ہی خلاف کیوں نہ پڑتا ہو۔ اللہ ظلم کو ناپسند کرتا ہے" اور اس نے یہ کتاب ظلم کو مٹانے کے لئے بھیجی ہے۔ اس نے اپنا رسول اسی لئے مبعوث کیا تھا کہ وہ اس سرزمین سے ظلم کو مٹائے اور اسے عدل سے بھر دے۔ لیکن اس بات کو کیا کہا جائے کہ ہم نے ترتیب ہی بدل دی ہے۔ ظلم کا نام عدل رکھ دیا ہے' بے انصافی کا نام انصاف' ظلم کرنا اپنا حق سمجھا ہے اور اختلاف کرنے والوں کو اپنا دشمن۔

ان حالات میں نہ مسائل حل ہو سکتے ہیں نہ امن قائم ہو سکتا ہے۔ طوفان کے تھمنے کو اپنی فتح سمجھنا بے عقلی سے زیادہ کچھ نہیں۔ جبر اور ظلم کے خلاف اٹھتے ہوئے جذبات کو دبایا نہیں جا سکتا۔ جو لوگ نادان دوستوں کے مشورے پر عمل کر رہے ہیں انہیں یقیناً ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ لوگ جو تاریخ سے سبق نہیں سیکھتے' ایک دن عبرت کے مقام پر کھڑے کر دیئے جائیں گے۔ OO

پوسٹ کوڈ نمبر ارسال کیجئے!

اگر آپ کو "ندائے خلافت" بذریعہ ڈاک موصول ہوتا ہے تو ازراہ کرم آپ ہمیں اپنا پوسٹ کوڈ نمبر جلد از جلد ارسال کر دیجئے۔ پوسٹ ماسٹر جنرل کی ہدایت کے مطابق آپ کے ایڈریس کے ساتھ پوسٹ کوڈ نمبر کا ہونا ضروری ہے۔

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن
K-36 ماڈل ٹاؤن' لاہور 54700

پاک افغان تعلقات..... کیا کھویا کیا پایا

کیا ہمارا حکمران ٹولہ صرف غلطی کرنا ہی جانتا ہے؟

افغانستان سے کلاشنکوف اور ہیروئن کلچر کے سوا پاکستان نے کیا حاصل کیا!!

اخذ و ترجمہ : سردار اعوان

کابل اور دہلی میں پیار کی پینگیں --- اسلام آباد کے منہ پر زوردار طمانچہ!!

مارچ ۱۹۹۱ء میں وزیر اعظم بے نظیر صاحبہ کی یہ تنبیہ کہ ''ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ افغان بڑے خود دار واقع ہوئے ہیں' ان پر اگر حکم چلانے کی کوشش کی گئی تو سارے کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا'' شاید دوسروں کے لئے تھی اور یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس حقیقت کا خود انہیں سامنا پیش آ سکتا ہے۔ جن بدترین حالات سے اس وقت پاکستان دوچار ہے اس کی شاید ہی انہیں توقع ہو گی۔

یقین نہیں آتا کہ ۸۹۔۱۹۷۹ء تک روسی قبضے کے خلاف مجاہدین کی مدد کرنے والا پاکستان روس کا شیرازہ بکھرنے کے تین ہی سالوں کے اندر کابل کے لئے اس قدر ناپسندیدہ کیوں ہو گیا ہے۔ ایسی کون سی غلطی ہو گئی' جس نے پاکستان کو کہیں منہ دکھانے کے قابل ہی نہیں چھوڑا!!!

کابل اور نئی دہلی کے درمیان حالیہ پیار کی پینگیں اسلام آباد کے منہ پر طمانچہ ہے۔ معزول شاہ کے برادر نسبتی' ہمایوں آصفی کابل میں دوست حکومت کی بجائے فرمانبردار حکومت کے قیام کی کوشش کو پاکستان کی سب سے بڑی غلطی گردانتے ہیں۔ جس سے حالات پلٹ کر کم و بیش اسی جگہ پہنچ گئے ہیں جہاں ۱۹۴۷ء میں تھے جب افغانستان نے پاکستان کے اقوام متحدہ میں داخلے کی مخالفت کی تھی۔

روسی حملے کے دوران دونوں ممالک کی دشمنی انتہا کو پہنچ گئی تھی مگر عوام میں کمیونسٹ حکومت کے خلاف نفرت نے پاکستان کو پختونستان کا مسئلہ حل کرنے کا ایک اچھا موقع عطا کر دیا۔ پاکستان کو صرف اتنا کرنا پڑا کہ کابل مخالف گروہوں کو اپنے ہاں پناہ دے کر امریکہ کے خرچ پر مسلح کر دیا۔

اس وقت کے صدر ضیاء کو بڑی امید تھی کہ کابل کی مستقبل کی قیادت انہی گروہوں میں سے ابھرے گی۔ ان کے نزدیک ایک ایسے کمیونسٹ مخالف 'افغان باغی لیڈر میں' جس کے ساتھ دوستی مفید ہو سکتی ہے دو باتوں کا ہونا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ وہ پختون ہو' کیونکہ افغانستان میں یہ گروہ ہمیشہ بالادست رہا ہے' دوسرے اسے پان اسلام ازم کا زبردست حمایتی ہونا چاہئے تاکہ بعد میں قومیتوں کا مسئلہ سر نہ اٹھائے۔

پشاور میں موجود مجاہدین کے لیڈروں میں حزب اسلامی کے گلبدین حکمت یار اس معیار پر پورے اترتے تھے۔ چنانچہ وہ آئی۔ ایس۔ آئی کی توجہ کا مرکز قرار پائے مگر بدقسمتی یہ ہوئی کہ ۱۹۹۲ء میں کمیونسٹ حکومت کے خاتمے پر حکمت یار کابل پر قبضہ جمانے میں ناکام رہے اور بعد میں کابل کو تباہ کرنے میں لگے رہے جو الگ ان کے لئے نفرت کا باعث بنا۔

حزب اسلامی کے لیڈر کی شکست کئی طرح سے آئی ایس آئی کی ناکامی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ ۱۹۹۳ء میں بے نظیر صاحبہ دوبارہ اقتدار میں آئیں تو انہوں نے افغانستان کے معاملات آئی ایس آئی سے لے کر اپنے قریبی ساتھی وزیر داخلہ' نصیر اللہ خان بابر کے سپرد کر دیئے جو افغانستان کی سیاست کو سمجھنے میں مہارت رکھنے کے علاوہ خود بھی پختون ہیں اور ایک ایسی پالیسی وضع کرنے میں مصروف کار ہیں جو سرد جنگ کے بعد کے حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے کار آمد ہو سکے۔

امریکہ کے نظریں پھیرنے کے بعد پاکستان وسط ایشیائی ریاستوں میں اثر و نفوذ بڑھانے کے خواب دیکھنے لگا مگر اس کی راہ میں افغانستان کی خانہ جنگی رکاوٹ تھی چنانچہ ۱۹۹۴ء میں ایک نئی قوت ''طالبان'' منظر عام پر آئی۔ اس میں زیادہ تر جنوب کے درانی قبیلہ کے لوگ شامل تھے جو روایتی طور پر شاہی خاندان سے قربت رکھتے ہیں۔ مجاہدین کے آپس کے جھگڑوں سے تنگ آئے ہوئے عوام نے اس مذہبی فوج کا خیر مقدم کیا' مگر کابل کے دروازوں پر احمد شاہ مسعود اور برہان الدین ربانی کی ''صدارتی'' فوج نے ان کی پیش قدمی کو روک دیا۔

طالبان کو جہاں افغانستان کے دولت مند تاجروں کی حمایت حاصل ہے' جو وسط ایشیا کے ساتھ تجارتی راستہ کھولنے کے لئے بیتاب ہیں' وہاں انہیں پاکستانی وزارت داخلہ کی بھی اشیرباد حاصل تھی۔ اسلام آباد اپنے آپ کو طالبان سے بری الذمہ قرار دیتے ہوئے کہتا ہے ''اگر ہم ان کی امداد کر رہے ہوتے تو کیا وہ یوں غائب ہو جاتے'' مگر بات یہ ہے کہ طالبان کے پاس جو ہوائی جہاز' ٹینک اور ہتھیار ہیں وہ سارے انہوں نے لڑائی میں تو نہیں چھینے!!

بہرحال طالبان یو این او کی مصالحتی کوششوں پر پانی پھیرتے ہوئے بڑی تیزی سے کابل کی طرف بڑھے۔ اس کے بعد اسلام آباد کی خواہشات کے برعکس حکمت یار کو کابل کے نواح سے نکال باہر کیا۔ یہ کارروائی پاکستان کے لئے تباہ کن ثابت ہوئی۔ مسعود اور ربانی کو جو پہلے ہی اندر سے پاکستان سے ناخوش تھے' سرحدی قبائل کو پاکستان کے خلاف بھڑکانے کا موقعہ مل گیا۔ پشاور میں مقیم ایک نامہ نگار کا کہنا ہے کہ ''کسی افغان مجاہد نے آج تک پختونستان

(باقی صفحہ ۱۰ پر)

WEEKLY "NIDA-E-KHILAFAT" LAHORE
36-K, Model Town Lahore- 54700 Regd:No L. 9184

مکتوبِ کراچی

فاتح ”کھچی گراؤنڈ“ ہوش کے ناخن لیں!!

مذاکرات کے ڈھونگ پر ایک دنیا ہنستی ہوگی

نجیب صدیقی

جعلی پولیس مقابلوں نے جوانوں کو بغاوت پر آمادہ کردیا ہے

کراچی میں جبر اور ظلم کے خلاف اُمڈتے ہوئے جذبات کو دبایا نہیں جاسکتا!!

وہ لوگ جو اخبار نہیں پڑھتے نسبتاً سکون سے رہتے ہیں لیکن آج کی دنیا میں ایسے بہت کم لوگ ہیں۔ صبح ہوتے ہی اخبار کا انتظار ہوتا ہے۔ جس دن اخبار کی چھٹی ہوتی ہے وہ دن بڑی بے کلی سے گزرتا ہے۔ اخبار کی سرخیاں پڑھ کر خون کی گردش بڑھ جاتی ہے۔ موت کا ایک رقص ہے جو مختلف عنوانات سے اخبار کی زینت ہوتا ہے۔ پڑھنے والا اگر حساس ہے تو اس کی سوچ پر ایسی ہر خبر تازیانہ بن کر گرتی ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہیں گنتی سے دلچسپی ہوتی ہے کہ کل تو بیس کا عدد تھا آج صرف چودہ پندرہ کا اسکور ہے!! شام کے اخبارات چیختے' دھاڑتے آتے ہیں اور فضا میں تلاطم پیدا کردیتے ہیں۔ اس پر مستزاد ”فاتح کھچی گراؤنڈ“ کا بیان ہوتا ہے جو فضا میں زہر گھول دیتا ہے۔

کراچی کے بسنے والے ان حالات میں ' اپنے اعصاب' جس میں تشنج کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے' جس سے مختلف عوارض نے جنم لیا ہے' مبتلا ہوگئے ہیں۔ ذہنی مریضوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ نوجوان طبقہ تو پیچ و تاب کھا کر انتقامی انداز میں سوچنے لگا ہے۔ جو لوگ سرد و گرم سے گزرتے ہوئے جوانی کی سرحد پار کرچکے ہیں وہ مایوس' خوف زدہ اور بیزار نظر آتے ہیں۔ وہ ماضی کی طرف دیکھتے ہیں تو ان کی اپنی قربانیاں رائیگاں نظر آتی ہیں۔ شاید حکومت وہ ردعمل پیدا کرنا چاہتی ہے جس سے لوگ آزادی سے نفرت کرنے لگیں' جمہوریت کو فریب نظر سمجھا جانے لگے اور انصاف کو ناقابل عمل۔ اس وقت حکومت کا سارا زور' دبانے' دھمکانے' ڈرانے اور کچلنے پر لگا ہوا ہے۔ طاقت کا نشہ ہر نشہ سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے یہاں تک کہ آدمی فرعون بن جاتا ہے اور ”انا ربکم الاعلیٰ“ کہنے لگتا ہے۔ اپنی حقیقت کو بھول جاتا ہے اور اللہ کی پکڑ سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

پولیس اور نیم فوجی دستے مختلف علاقوں میں گھیرا ڈال کر لوگوں کو پکڑتے ہیں۔ انہیں ذلت کے ساتھ ایک جگہ جمع کیا جاتا ہے پھر انکی شناخت ہوتی ہے اور

”اس وقت حکومت کا سارا زور دبانے' دھمکانے' ڈرانے اور کچلنے پر لگا ہوا ہے' اس لئے کہ طاقت کا نشہ ہر نشہ سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے یہاں تک کہ آدمی فرعون بن جاتا ہے اور ”انا ربکم الاعلیٰ“ کی صدا لگانے لگتا ہے“

ان میں سے چن کر کچھ افراد نکال لئے جاتے ہیں' بقیہ بے آبرو ہو کر گھر واپس آجاتے ہیں۔ اس کھیل کا نام ”آپریشن“ رکھا گیا ہے۔ وہ شہری جو ٹیکس ادا کرکے ان اداروں کو ”نان و نفقہ“ مہیا کرتے ہیں' ان کے ساتھ یہ وحشیانہ سلوک جمہوریت کے نام پر ہو رہا ہے۔ جبکہ اسلام آباد سے بار بار کہا جاتا ہے کہ صرف چند روز کی بات رہ گئی ہے' چن چن کر سب دہشت گرد پکڑ لئے جائیں گے یا ہلاک کردیئے جائیں گے۔ جانے وہ کونسا قانون ہے جس نے پکڑ کر ہلاک کرنے کی کھلی چھٹی دے دی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پولیس مقابلے میں مارے گئے۔ جھوٹ بولنے والوں کو اتنا بھی سلیقہ نہیں آتا کہ مقابلہ ہوا تھا' دہشت گرد مارے گئے مگر پولیس کو کوئی خراش تک نہیں آئی۔ جبکہ گھر والے کہتے ہیں کہ گھروں سے گرفتار کیا گیا ہے اور مارنے کے بعد جعلی مقابلہ دکھایا گیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس بات کی تصدیق کون کرے۔ مارنے والے بھی وہی' منصف بھی وہی اور داد و فریاد سننے والے بھی وہی۔ فرعون کے دربار میں ایک شخص نکل آیا جس نے فرعون کو اس کے انجام بد سے ڈرایا تھا۔ اس دربار میں ایک شخص بھی ایسا نہیں جو یہ کہہ سکے کہ۔

ظلم کی ٹہنی کبھی پھلتی نہیں
ناؤ کاغذ کی سدا چلتی نہیں

وہ شخص جو ”خیر و شر“ (حزب اختلاف و حزب اقتدار) کا نگران ہے' جس پر اپنی ”رعایا“ کی نگرانی کی ذمہ داری ہے ”مٹی کا مادھو“ بن گیا ہے۔

ایک طرف یہ کہا جاتا ہے کہ بہت جلد ہم اہل کراچی کا دل جیت لیں گے۔ تذلیل' تحقیر' گولی' گالی اور ظلم سے اگر دل جیتا جاسکتا ہے تو یہ ایک بہت بڑی دریافت ہوگی اور اس کے موجد ہمارے حکمران ہوں گے!! کچھ اسی طرح دل جیتنے کی کوشش اہل مشرقی پاکستان سے کی گئی تھی' شاید یہی وجہ ہے کہ دل جیتنے کی اہم ذمہ داری اس شخص کو دی گئی ہے جس کا تجربہ مشرقی پاکستان کا ہے۔ ملکی معاملات کو چلانے کے لئے جن صفات کی ضرورت ہوتی ہے' حکمران اگر ان سے تہی دست ہو جائیں تو وہی کچھ ہوگا جو آج کراچی میں

(باقی صفحہ ۲۲ پر)